عظیم لوگوں کی کامیابی کے راز

آیۃ اللہ استاد جعفر سبحانی

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

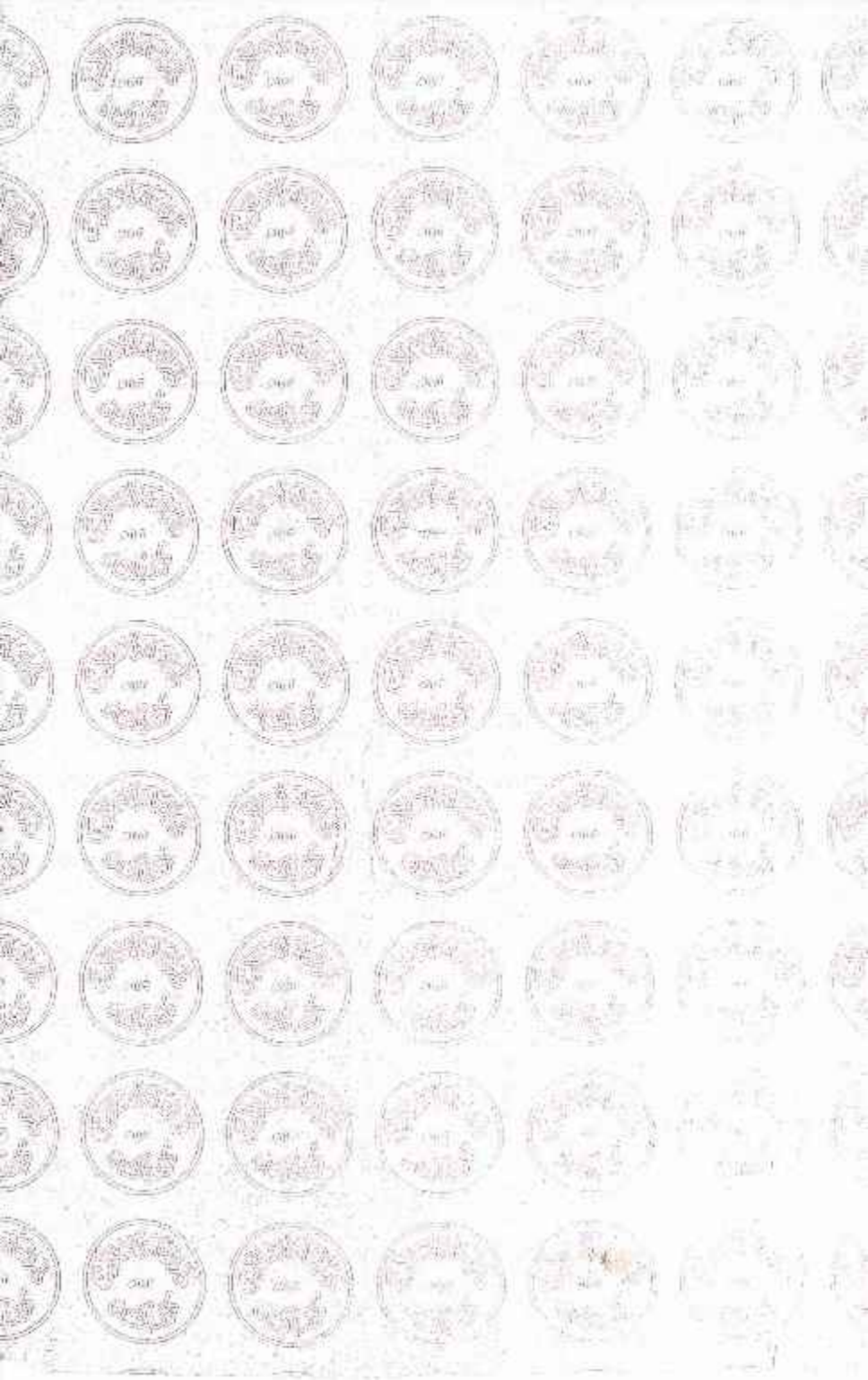

60/- 45/-

عظیم لوگوں کی کامیابی کے راز

آیۃ اللہ استاد جعفر سبحانی

یکے از مطبوعات

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

۲ - جے - ۵/۴ ـــ ناظم آباد ـــ نمبر ۲ ـــ کراچی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب ---------- عظیم لوگوں کی کامیابی کے راز
مصنف ---------- استاد جعفر سبحانی
ترجمہ ---------- مولانا اسد علی شجاعتی
نظر ثانی ---------- سید سعید حیدر زیدی
کتابت ---------- سید جعفر صادق
ناشر ---------- دار الثقافة الاسلامية پاکستان
طبع اول ---------- ربیع الاول ۱۴۱۱ھ۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء
طبع پنجم ---------- سفر ۱۴۲۲ھ۔ جون ۲۰۰۱ء

بسم الله الرحمن الرحيم

وأن ليس للإنسان إلا ما سعى

ترتیب

مقدمہ ۷

حصہ اوّل : کامیابی کے حقیقی اسباب ۱۱

ذوق وشوق ۱۲

جہدِ مسلسل ۲۰

مقصد پر ایمان ۳۰

صبر واستقامت ۳۷

یک سوئی ۴۸

نظم وضبط ۵۳

تدریجی ارتقاء ۵۷

اندھی تقلید سے اجتناب ۶۳

مشاورت ۸۰

تاریخ بہترین استاد ہے ۸۵

فرصت سے استفادہ ۹۱

عزمِ صمیم ۹۸

ماحول سے واقفیت ۱۰۷

'ناکامیاں' کامیابی کا زینہ ہیں ۱۱۷

شجاعت و بے باکی ۱۲۳

ایثار و فداکاری ۱۳۱

مشکلات و مصائب ۱۳۴

حقیقت پسندی ۱۴۲

لچک دار رویّہ ۱۴۸

صحیح طریقہ ۱۵۳

حصہ دوم : کامیابی کے موہوم اسباب ۱۵۷

غیر متوقع کامیابی ۱۵۸

اتفاقات کا انتظار ۱۶۹

تقدیر کا غلط مفہوم ۱۷۷

موروثی ثروت ۱۸۳

مقدمہ

امید و آرزو کا زمانہ

جوانی کا زمانہ، امید و آرزو کا زمانہ ہے۔ خوش و خوشحال رہنے کا زمانہ ہے۔ زندگی کے اس دور میں ہر جوان کے لیے اس کا مستقبل شیریں خوابوں کی مانند اُس کی توانا آنکھوں کے سامنے مجسّم ہو جاتا ہے۔ وہ غور کرتا ہے — پروگرام بناتا ہے اور اپنے ذہن میں بڑی بڑی آرزوئیں محفوظ کر لیتا ہے۔

لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص جوانی کے زمانے میں ہی ڈھیر ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص بڑھاپے تک پہنچ جائے تو بھی اپنی کسی انتہائی معمولی آرزو کی تکمیل نہیں کر پاتا۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خلاف توقع کوئی شخص اپنی امید سے بڑھ کر پا لیتا ہے اور اس کے تمام شیریں خواب حقیقت کا روپ ڈھال لیتے ہیں۔

یقیناً ایک شخص کی شکست اور دوسرے کی کامیابی، یہ دونوں بلا سبب نہیں ہیں۔ ان دونوں کا سبب ان کی اپنی اپنی زندگی میں تلاش کرنا چاہیے۔

آپ مطمئن رہیے کہ جو شخص کامیاب ہوجاتا ہے وہ ایسے راستے سے زندگی کے صحن میں داخل ہوتا ہے کہ کامیابی اس کے قدم چوم لیتی ہے اور جو شخص شکست کھا جاتا ہے وہ غالباً اشتباہات کے سبب سے ہوتا ہے۔ ایسی غلط راہوں کی وجہ سے ہوتا ہے جن پر وہ خود اپنے قدموں سے چل کر جاتا ہے۔

اس کتاب میں ہمارا مقصد دنیا کے کامیاب لوگوں کی کامیابی کے بعض اسباب بیان کرنا ہے تاکہ جوان نسل ان کے مفید لائحۂ عمل اور تجربوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے اور ایسے ہی راستے پر قدم رکھے جو پہلے سے ہموار ہے اور زندگی کے پر پیچ و خم، سنگلاخ اور انجانے راستوں پر قدم بڑھانے سے پرہیز کرے۔

عظیم لوگوں کی کامیابی کے راز ایک دو نہیں ہیں۔ البتہ ان کی کامیابی کا ایک حصہ ان کی باطنی صلاحیتیں اور وہ اعلیٰ ذہانتیں ہوتی ہیں جو ان کو "ورثہ" کے طور پر یا کسی اور سبب سے ملی ہوتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے اسباب کوشش سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ خدا کی دین ہوتے ہیں جو خدا نے زندگی کا نظام چلانے کے لیے انھیں عطا کیے ہیں۔

لیکن اس کتاب کے آئندہ صفحات یہ بات ثابت کردیں گے کہ اگرچہ اس قسم کے اسباب جوانوں کی ترقی کے لیے مؤثر ہیں لیکن ان کا اثر زیادہ نہیں ہے۔ ترقی کے اصل اسباب کچھ اور ہیں، اور وہ ایسے ہیں کہ مستقبل کی بہتری کا خواہش مند، ہر شخص انھیں بآسانی اختیار کر سکتا ہے — اور ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔ اور اگر اس ذریعہ سے وہ دنیا کے ذہین ترین

انسانوں کی حد تک نہ بھی پہنچے تو بھی کم از کم معاشرے کا ایک ممتاز اور معروف شخص بن سکتا ہے اور اتنی کامیابی بھی قابل تحسین اور لائق تعریف ہے۔ جب کہ بہت سے جوان ترقی کی راہ گم کر دیتے ہیں اور اس کامیابی سے محروم رہتے ہیں۔

انسان کی ترقی اکثر طور پر تربیت، فعالیت، کوشش اور مخصوص پروگراموں کی رہین منت ہوتی ہے۔ اس کتاب کے حصہ اوّل میں یہی باتیں پڑھنے والوں کی نظر سے گزریں گی۔ اور "وراثت" اور ورثہ کا اثر ان اسباب کی نسبت بہت کم ہوتا ہے۔

اب ہم دنیا کے عظیم لوگوں کی کامیابی کے اسباب مختصر طور پر زندہ مثالوں کو ذکر کرتے ہوئے قابلِ احترام پڑھنے والوں کی نذر کرتے ہیں۔

(جعفر سبحانی)

حصّہ اوّل

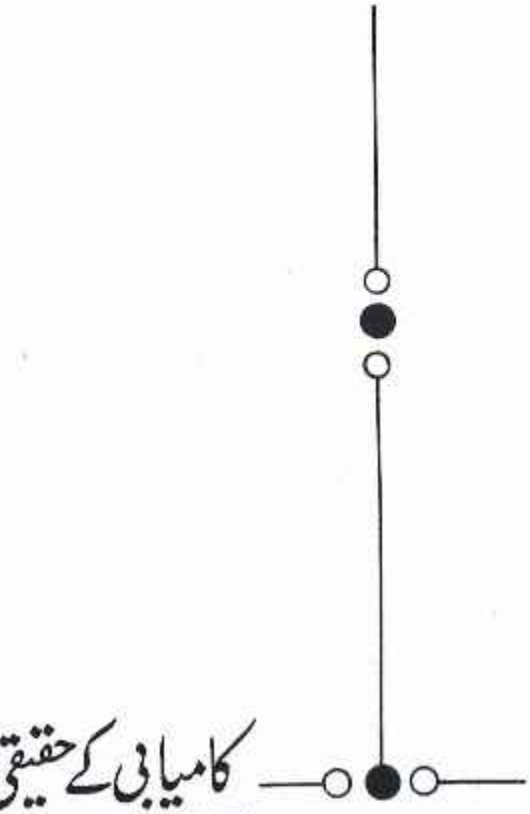

کامیابی کے حقیقی اسباب

ذوق وشوق

کامیابی کا ایک راز یہ ہے کہ کسی ایسے کام کو اپنائیں جو آپ کے ذوقِ روحی اور فکری توانائی اور سلیقے کے مطابق ہو۔

خدا نے سب کو ایک جیسا پیدا نہیں کیا ہے۔ تمام انسانوں کو ہر کام کرنے کی صلاحیت عطا نہیں کی ہے۔ بلکہ معاشرے کی گاڑی کے پہیوں کو چلانے کے لیے اس نے ہر فرد کو ایک خاص ذوق عطا کیا ہے۔ ایک مخصوص صلاحیت دی ہے تاکہ وہ ایسے ہی کام کو اپنائے جس کا وہ ذوق رکھتا ہے اور تاکہ وہ ایسا کام انجام دے جس کا تعلق اس کے باطنی عشق اور فطری صلاحیت سے ہو۔

عموماً جوانوں کی شکست اور ناکامی کا ایک سبب اس مسلّم اصول سے انحراف ہے۔ وہ غلط پروپیگنڈے اور نامناسب تربیت کے نتیجے میں ایسے کام کے پیچھے جاتے ہیں جس کا انھیں ذوق نہیں ہے۔ وہ ایسے کاموں کو نہیں اپناتے جن کی صلاحیت اور لیاقت ان میں پائی جاتی ہے۔

وہ لوگ اس مانے ہوئے اصول کو فراموش کر دیتے ہیں کہ :

" ہر دماغ میں کچھ نہ کچھ ہیجان ہوتا ہے
خوش قسمت وہ ہے جو اپنے ذوق کو
دریافت کر لے "

مجھے یاد ہے کہ انیس سو اکاون[۵۱]، باون[۵۲] اور ترپن[۵۳] میں تیل کا مسئلہ عوام میں سرایت کر گیا تھا۔ ہر ایرانی مرد اور عورت تیل ہی کے بارے میں سوچتا تھا۔ تیل کی صنعت کے ماہرین کی قدر و قیمت معاشرے میں بہت زیادہ بڑھ گئی تھی اس ماحول کی وجہ سے اکثر طلبہ کا طرز فکر بدل گیا تھا۔ سب یا بیشتر طلبہ "تیل" کے شعبے ہی سے وابستہ ہونا چاہتے تھے، حالانکہ ان میں سے بیشتر کا ذوق اس سلسلے میں نہیں تھا۔

کسی طالب علم کی ترقی اور کامیابی پر کاری ضرب لگ جاتی ہے اگر وہ اپنی صلاحیت اچھی طرح پہچانے بغیر کسی ایسے کام کو اختیار کرے جس کا اس میں ذوق نہ ہو۔

مثلاً اگر کوئی جوان ادبی ذوق رکھتا ہے، اس کی گفتار اور اس کے قلم سے ادب و شعر کی بارش ہوتی ہے اور حساب اور ریاضی کی طرف اس کا ذہن مائل نہیں ہے تو یقیناً اس کی کامیابی ادبی کام کے علاوہ کسی اور کام میں یقینی نہیں ہوگی۔

ایک ماہر مصوّر کی سوانح سے ایک ورق

میں ایک ماہر مصوّر کی یادداشت سے مختصر طور پر اس کا قصہ نقل کرتا ہوں :

وہ کالج کے زمانے میں ایک کاہل طالب علم تھا۔ نہ خود سبق پڑھتا تھا نہ اپنے ہم جماعت ساتھیوں کو پڑھنے دیتا تھا۔ وہ خود اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی راستے کا کانٹا بنا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی آنکھوں، ابرو اور پیشانی سے اس کے باصلاحیت ہونے کا پتہ چلتا تھا۔

ایک ماہر نفسیات پروفیسر نے اُسے اپنے پاس بلایا۔ کچھ نصیحت کی اور ایسے طرزِ زندگی کے بُرے نتائج سے اُسے ڈرایا۔ انھوں نے کہا کہ

"باپ کا سایہ ہمیشہ کسی انسان کے سر پر نہیں رہتا
زندگی میں مشکلات بہت زیادہ ہیں۔ ایسا طرزِ
زندگی تمھارے لیے پسماندگی کا سبب بنے گا..."

جب وہ یہ باتیں کر رہے تھے تو اچانک ان کی توجہ اس بات پر گئی کہ وہ طالب علم باتیں سننے کے ساتھ ساتھ کوئلے کے ٹکڑے سے فرش پر ایک ایسے پرندے کی تصویر بنا رہا تھا جو پتّوں سے بھری ہوئی شاخ پر بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

ذہین پروفیسر سمجھ گئے کہ یہ لڑکا مصوّری کے لیے پیدا ہوا ہے اور الجبرا کے فارمولوں سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ یہ اس راہ میں جتنی بھی کوشش کرلے اس کو فائدہ کم ہی پہنچے گا۔

انھوں نے اپنی یہ ذمّہ داری محسوس کرتے ہوئے طالب علم کے سرپرست کو اپنی تشخیص سے آگاہ کیا۔ انھوں نے اس کے والد سے کچھ اس طرح کہا کہ:

"آپ کا بیٹا مصوری کا بہت ذوق رکھتا ہے۔
اگر آپ اس کا شعبہ تبدیل کروادیں تو شاید یہ
مصوّری کے شعبے میں نام پیدا کرے۔"

زمانہ گزرا اور تجربہ کار پروفیسر کی بات صحیح ثابت ہوئی۔ وہ لڑکا بہت

جلد ایک ماہر اور ہنرمند مصور بن گیا۔

"ایڈیسن" سے لوگوں نے پوچھا کہ

"جوانوں کی اکثریت کامیاب زندگی کیوں نہیں
گزار پاتی ہے ——————— ؟"

تو اس نے جواب دیا :

"اس لیے کہ وہ اپنی راہ سے واقف
نہیں ہوتے اور کسی دوسری راہ پر
چلنے لگتے ہیں !"

ایسے افراد معاشرے کے لیے دو طرح سے مضر اور نقصان دہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ایسا کام اختیار نہیں کرتے جس کی لیاقت ان میں ہے اور جس میں وہ کامیاب ہو سکتے ہیں ——— اور ——— دوسرا ضرر یہ کہ وہ ایسی ذمہ داری اپنے سر لے لیتے ہیں جسے بخوبی پورا کرنا ان کے بس میں نہیں ہوتا۔

استعداد کا تیر

ہر فرد کی استعداد کا تیر، اس کی ولادت کے زمانے ہی سے اس کام کی نشاندہی کرتا ہے جس کے لیے وہ پیدا ہوا ہے۔ خوش قسمت وہ شخص ہے جس کے سرپرست اس تیر کے سمت کو پہچان لیں۔ آجکل ترقی یافتہ ممالک میں خاص آزمائشوں کے ذریعے افراد کی صلاحیت جانچی جاتی ہے اور ان کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اسی شعبے کو اختیار کریں جس کی صلاحیت ان میں ہے۔

کاش ! کہ سائنسدان حرارت اور زلزلہ ناپنے کے آلوں کے ساتھ

ساتھ "صلاحیت ناپنے کا آلہ" بھی ایجاد کرتے اور وہ آلہ تعلیمی اداروں میں نصب ہوتا۔ اس طرح لاکھوں انسانوں کی صلاحیت، ماحول کی خرابی اور سرپرستوں اور والدین کی کم فہمی کی وجہ سے ضائع نہ ہوتی۔

گیلیلیو، بچپن میں بچوں کے کھلونے بنانے کا شوقین تھا۔ اس کے والد نے اپنے بیٹے کے شوق کے برخلاف اُسے "طب" پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اس راہ میں ترقی نہیں کی۔ بعد میں اس نے ریاضی اور فزکس سیکھی جس کے نتیجے میں اس کی اعلیٰ ذہانت علمِ نجوم اور ایسے علوم میں ظاہر ہوئی جن کی اس میں صلاحیت تھی۔

گیلیلیو وہ سب سے پہلا شخص تھا جس نے ثابت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ وہ سب سے پہلا شخص تھا جس نے گھڑی کا "پینڈولم" بنایا۔

ٹالسٹوائے، ابھی بچہ ہی تھا کہ اسے کتابوں کے مطالعے کا شوق ہو گیا اس نے فلسفہ کی کافی کتابیں پڑھیں۔ اس دوران وہ کوشش کرتا تھا کہ زندگی کے اہم مسائل چھیڑے۔ عمر کے اختتام تک اس کی فکر کی سلطنت میں یہی باتیں تھیں۔

جارج مورلینڈ، جانوروں کی تصویریں بناتا تھا۔ چھ سال کی عمر ہی سے اس کا فنِ مصوری ظاہر ہو گیا۔ اگرچہ کہ اس نے کُل اٹھ سال ہی عمر پائی مگر اس نے مصوری کی بہت گرانقدر یادگاریں چھوڑی ہیں۔

زراہ کالبرن، کی ریاضی میں استعداد، بچپن ہی سے ظاہر تھی۔ کبھی اس سے لوگ پوچھتے تھے کہ ایک سال میں یا اس سے زیادہ عرصہ میں کتنے سیکنڈ ہوتے ہیں تو وہ ذرا سی دیر میں صحیح جواب دے دیتا تھا۔

جیمز واٹ، کئی مشینوں کا موجد اور بھاپ کی طاقت کو دریافت کرنے والا شخص تھا۔ وہ اپنے بچپن کے آغاز ہی سے تجربات کا بہت دلدادہ تھا۔ اس نے علمِ طبیعیات (فزکس) میں اس طرح کئی کامیابیاں حاصل کیں۔

ڈارون نے بچپن ہی سے جانوروں کی مختلف اقسام پال رکھی تھیں اس کے اس جذبے نے اسے اُکسایا کہ وہ حیوانات کے ثبات یا تبدیلی کے بارے میں مطالعہ کرے۔ اس نے ایک طولانی سفر کے بعد ایک کتاب چھپوائی جس میں اس نے مختلف انواع کے جانوروں کی اصل اور ان کی تبدیلی کے بارے میں نظریہ پیش کیا۔

خود کو پہچانیے

ہمارے مذہبی پیشواؤں کا تاکید کے ساتھ یہ حکم ہے کہ ہم خود کو پہچانیں۔ اپنے وجود کے سمندر میں غوطہ لگا کر اپنا باطن پہچاننے کی کوشش کریں۔

ہمارے باطن کے رجحانات مقناطیس کی طرح سے ہوتے ہیں کہ اپنی جیسی چیزوں کو کھینچ لیتے ہیں اور "حافظہ" کے خزانے میں جمع کر کے ضرورت کے وقت ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ہم جو سیکھتے ہیں اگر وہ ہمارے ذوق اور باطنی رجحانات کے مطابق ہو تو وہ سیکھی ہوئی چیز بآسانی حافظہ کے خزانے میں محفوظ ہو جاتی ہے اور لمبی مدت تک باقی رہتی ہے۔

لیکن اگر ہم ایسا کام کریں جو ہمارے باطنی رجحانات کے مطابق نہ ہو تو ہمارا ذہن اسے فراموش کر دیتا ہے۔ اور اس طرح ہماری کامیابی کے

امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں۔

ایسا شخص جو اپنی صلاحیت اور اپنے رجحانات سے منحرف ہو گیا ہو' بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے دریا کے بہاؤ کے مخالف سمت میں تیرنا شروع کر دیا ہو۔ یا وہ شخص ایسا ہے کہ جس نے خود کو سمندر کی کوہ پیکر موجوں کے حوالے کر دیا ہو۔ ایسا شخص نہ ہونے کے برابر کامیابی حاصل کرتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ——————

جب انسان اپنی لیاقت و صلاحیت کو پہچان لیتا ہے اور اپنی استعداد کے مطابق کام کو قبول کرتا ہے تو چونکہ اس میں اس سلسلے میں عشق اور باطنی کشش پائی جاتی ہے اس لیے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چھپی ہوئی صلاحیتیں

بعض صلاحیتیں خاص زمانے میں ظاہر ہوتی ہیں۔ زبردست ماہر نفسیات اس قسم کی صلاحیتوں کو تشخیص دے سکتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اپنے سیکھنے کے ابتدائی دور میں احمق اور کم عقل نظر آتے ہیں لیکن بعد میں یہی لوگ مخصوص زمانے میں انتہائی ذہین ثابت ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فطری قوانین کے تحت اس قسم کی صلاحیت کے لیے خاص حالات کی ضرورت ہوتی ہے۔

کہتے ہیں کہ "آئن اسٹائن" جو کہ اپنے زمانے کا عظیم اسکالر اور ریاضی دان تھا وہ ابتدائی جماعتوں میں فیل ہو جایا کرتا تھا لیکن مخصوص ماحول میں اس کی صلاحیت خود بخود ظاہر ہو گئی۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض افسر ایک مدت تک بے ہمت اور ڈرپوک مشہور رہتے ہیں لیکن جب کام کا موقع آتا ہے تو ایسی بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں کہ منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ جائیں۔

ملک شاہ سلجوقی تک خبر پہنچی کہ قیصر روم بغداد فتح کرنا چاہتا ہے۔ شاہ سلجوقی نے باقاعدہ فوج کے ساتھ ایران کی سرحد کی طرف حرکت کی۔

(وزیر) خواجہ نظام الملک نے ایک دن فوج کا معائنہ کیا۔ اس کی نگاہ ایک چھوٹے قد کے فوجی پر پڑی۔ اس نے حکم دیا کہ اسے صف سے نکال دیا جائے۔

اس کا خیال تھا کہ یہ چھوٹے سے قد کا فوجی کچھ کام نہیں کر پائے گا۔

لیکن ملک شاہ نے اس (وزیر) سے کہا کہ:

"تم کو کیا خبر؟ ہو سکتا ہے کہ یہی فوجی، قیصر کو گرفتار کرے۔"

اتفاق سے مسلمانوں کو کامیابی نصیب ہوئی اور روم کا بادشاہ قیصر، اسی چھوٹے سے قد کے فوجی کے ہاتھوں گرفتار ہوا!

جہدِ مسلسل

دنیا کا نظام اور تاریخ کا ہر صفحہ اس بات کی واضح طور پر گواہی دیتا ہے کہ ہر شخص کی کامیابی اس کی کوشش سے وابستہ ہوتی ہے۔ سینکڑوں کیمیائی عمل اور ردعمل ہوتے ہیں تو کہیں جا کر ایک پودا بھرپور درخت میں تبدیل ہوتا ہے۔ ہر ذی روح فطری طور پر یہ جانتا ہے کہ اس کی حیات کی بقا، کام اور کوشش کی رہینِ منت ہے۔

ہمارے بعض جوانوں کی ناکامی کے کئی اسباب ہوتے ہیں۔ ان اسباب میں سے ایک یہی ہے کہ کام کرنے اور چاق و چوبند رہنے کی روح ان میں ختم ہو چکی ہوتی ہے۔

مختلف چھوٹے چھوٹے اداروں کی طرف جوانوں کا ہجوم اس بات کی واضح طور پر گواہی دیتا ہے کہ بڑے کاموں سے عشق ان میں کم ہو چکا ہوتا ہے۔

یہ جوان مال پیدا کرنے والے بننے کے بجائے مال خرچ کرنے والے بن جاتے ہیں۔

کامیاب لوگوں کی زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ وہ سب کے سب کام اور کوشش کے بندے تھے۔ اپنے زمانے کے انتہائی ذہین شخص "ایلگزینڈر ہیملٹن" نے کہا کہ:

"لوگ کہتے ہیں کہ تم انتہائی ذہین ہو
لیکن مجھے اپنی انتہائی ذہانت کی خبر
نہیں ہے۔ میں تو بس یہ جانتا ہوں
کہ میں ایک محنت کرنے والا شخص
ہوں ——— !"

ایک اور دانشمند نے کہا تھا کہ:

"آج میں جو کچھ بھی ہوں یہ میرے
کام کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنی زندگی
میں ایک لقمہ بھی محنت کے بغیر
نہیں کھایا ہے۔"

یہ حیرت انگیز ایجادات، سائنسدانوں کی انتھک محنتوں کا نتیجہ ہیں۔ ریڈیو کا موجد کبھی کبھی رات سے صبح تک کام کرتا رہتا جب کہ اس کے اہل خانہ سوئے ہوئے ہوتے تھے۔

"ایڈیسن" اپنی بعض ایجادات کو مکمل کرنے کے لیے کئی دن اور کئی راتوں تک اپنی تجربہ گاہ سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ بجلی کی طاقت کو اس طرح قابو میں لینے کے لیے کہ اس سے استفادہ سستا اور آسان ہو، بارہا ایسا اتفاق ہوا

کہ وہ دو تین دن تک تجربہ گاہ ہی میں مصروف رہا، بعض اوقات وہ کھانا کھانا تک بھول جاتا تھا اور کبھی روٹی کے چند سوکھے ٹکڑوں پر اکتفا کر لیتا تھا۔

فرانس کے عظیم اسکالر "پاسچر" کی زندگانی میں ہم پڑھتے ہیں کہ اس کی زندگی کا بنیادی اصول "کام" تھا۔ کبھی وہ کام میں اتنا مشغول ہو جاتا تھا کہ تجربہ گاہ سے باہر ہونے والا شور و غل تک اسے سنائی نہیں دیتا تھا۔ حتیٰ کہ جب جرمن فوج نے "پیرس" کی طرف پیش قدمی کی اور اس کا محاصرہ کر لیا، اور دشمن کی توپوں کی گرج نے قیامت کا شور بپا کیا ہوا تھا تو بھی وہ اپنی تجربہ گاہ میں کام کرتا رہا۔

"نپولین" چوبیس گھنٹوں میں صرف پانچ گھنٹے سوتا تھا اور باقی انیس[19] گھنٹے وہ کام میں مشغول رہتا تھا۔

مشرق کا انتہائی ذہین شخص "ابن سینا" بہت محنتی اور نہایت مطالعہ کرنے والا شخص تھا۔ اس کی کئی قسم کی کتابیں اس کی انتھک محنت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ علم فلسفہ میں اس کی کتاب "شفا" اور علم طب میں اس کی کتاب "قانون" یہ دونوں کتابیں عالمگیر شہرت کی حامل ہیں۔ اس کی اس دوسری کتاب کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

مسلمان دانشمند "ابن رشد" نے جب سے پڑھنا سیکھا اس وقت سے اپنی عمر کا ایک دن بھی مطالعہ اور غور و فکر کے بغیر نہیں گزارا۔

"جواہر الکلام" ایک نفیس کتاب ہے۔ اور اسلامی فقہ کا ایک سرچشمہ ہے

آج تک علم فقہ میں اتنی جامع کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی آخری طباعت میں تقریباً چالیس ضخیم جلدیں شامل ہیں۔

ایک عالی قدر عالم آقائے محمد تقی قمی ایک ایرانی شخصیت ہیں اور مصر میں رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"ایک دن جب میں نے اس کتاب کی تمام جلدیں مصر کی یونیورسٹی کے اساتذہ کو دکھائیں اور انھیں بتایا کہ یہ تمام جلدیں اتنی باریک بینی کے ساتھ ایک اکیلے آدمی نے لکھی ہیں تو انھوں نے میری بات سُن کر غیر معمولی تعجب کا اظہار کیا۔"

ایک بزرگ استاد مرحوم آقائے شاہ آبادی جو سائنس، فلسفہ اور علم کلام کے ماہر تھے وہ نقل کرتے تھے کہ میرے والد "جواہر الکلام" کے مصنف[1] کے شاگردوں میں سے ایک تھے۔ ایک دن جب اس عظیم عالم کا ہونہار اور لائق بیٹا اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ میت کے غسل کے بعد رات ہو گئی اس لیے یہ طے ہوا کہ میت کو امیر المومنین علی علیہ السلام کے صحن مطہر کے اطراف میں بنے ہوئے کمروں میں سے ایک میں رکھ دیا جائے اور اگلے دن سب لوگوں کی شرکت کے ساتھ تشییع جنازہ ہو۔

اگرچہ کہ "جواہر" کے مصنف نے ابھی ابھی بیٹے کا داغ اٹھایا تھا پھر بھی انھوں نے اپنے عزیز بیٹے کے بدن کے پاس کچھ قرآن مجید پڑھنے کے بعد مطالعے اور لکھنے کے پروگرام میں کوئی تعطیل نہیں کی اور انتہائی صبر اور مستقل مزاجی کا ثبوت دیا۔

---

[1] الشیخ محمد حسن النجفی

اسلام کے عالی قدر مرجع مرحوم آقائے 'بروجردی' فرماتے تھے کہ

" ایک رات میں علم اصول کے ایک مسئلے (ترتّب)
کے بارے میں غور کر رہا تھا اور لکھتا جا رہا تھا۔ میں
مطالعہ، غور و فکر اور لکھنے میں اتنا مصروف ہوا
کہ سونے کا خیال تک نہ آیا۔ پھر جب اذان کی آواز
میرے کان تک پہنچی تو مجھے معلوم ہوا کہ صبح ہو گئی
ہے اور میں رات بھر کام میں مشغول رہا ہوں۔"

خلاصہ یہ کہ ہم قدیم کہانیوں میں پڑھتے ہیں کہ زمین میں مختلف مقامات پر خزانے دفن ہیں اور ہر خزانے کا محافظ ایک ایک " اژدھا " ہے اور جب تک ہم اس اژدہے پر غالب نہ آئیں ہم خزانے تک نہیں پہنچ سکتے۔

بہت سے لوگ اس کو من گھڑت کہانی سمجھتے ہیں اور بعض لوگ اسے حقیقت سمجھتے ہیں لیکن اس پر غور نہیں کرتے۔

حالانکہ اس مطلب میں ایک اور حقیقت پوشیدہ ہے۔ وہ خزانے دراصل ذہنی یا جسمانی صلاحیتیں ہیں جو انسان کو عطا کی گئی ہیں اور وہ اژدہے دراصل منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے مشکلات اور مشقتیں ہیں۔

"ایڈیسن" کہتا ہے کہ :

" میری کوئی بھی ایجاد اتفاقی نہیں ہے۔ جب بھی مجھے
خیال آتا تھا کہ فلاں کام کا کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا
ہے میں خود کو اس کام سے وابستہ کر لیتا تھا۔ تجربہ پر
تجربہ کیے جاتا تھا۔ یہاں تک کہ کامیاب ہو جاتا تھا۔"

"نیوٹن" کہتا ہے کہ :

" اگر میں کسی مقام تک پہنچا ہوں تو یہ کام اور کوشش کا نتیجہ ہے"۔

"میکلانج" کہتا ہے کہ :

" اگر لوگ جانتے ہوتے کہ میں نے استادی کے اس مقام کو پانے کے لیے کیا کیا زحمتیں اٹھائی ہیں تو وہ میرے ہنر کی حیرت انگیز چیزوں پر تعجب کا اظہار نہ کرتے "۔

"بزرگ مہر" کے بقول :

" منہ بند رکھنا چاہیے اور ہاتھ آزاد۔ کام کرنا چاہیے اور دم نہیں مارنا چاہیے اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ کامیابی کی طلائی کنجی کوشش ہے"۔

قید خانے کے شاہکار!

واقعی بعض لوگوں کی روح بہت عظیم ہوتی ہے۔ سمندر کی طرح بے قرار ہوتی ہے۔ منزلِ مقصود اور کام سے ان کا عشق انھیں مصروف کر دیتا ہے حتیٰ کہ وہ زندگی کے سخت لمحات میں بھی کام اور کوشش سے دستبردار نہیں ہوتے۔

عظیم مسلمان مورخ "ابن خلدون" نے "مقدمہ بر تاریخ" کے نام سے اپنا نفیس شاہکار جلاوطنی کے دور میں لکھا تھا۔

مشرق کے فلسفی "خواجہ نصیر الدین طوسی" کو اسماعیلیوں نے "موت کے قلعے" نامی ایک جیل میں قید کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنی عظیم اور بیش قیمت کتاب " شرح اشارات" اسی جیل میں لکھی تھی۔

ہمارے عظیم عالم "شہید اوّل" نے اسلامی قوانین کے متن پر مبنی

عظیم کتاب "لمعہ" دمشق کے قید خانے میں لکھی تھی۔

"سر والٹر الہ" نے "تاریخ دنیا" قید خانے میں لکھی تھی۔

"رابن کرمو" نے انگلستان کی شاہکار ادبیات قید خانے میں تخلیق کی تھیں۔

ہم اس سلسلے کو یہیں ختم کرتے ہیں اور کام و کوشش سے متعلق بزرگانِ دین کے اقوال پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

کام و کوشش بزرگانِ دین کی نظر میں

رسول اکرمؐ نے ایک کاریگر کو دیکھا جس کا ہاتھ سوج گیا تھا۔ آپؐ نے اس کا ہاتھ بلند کیا اور فرمایا:

"دوزخ کی آگ کبھی بھی اس ہاتھ کو نہیں جلائے گی یہ ہاتھ ایسا ہے کہ جسے خدا اور اس کا رسولؐ پسند کرتے ہیں۔ جو شخص بھی محنت کرکے اپنی زندگی گزارے گا، خدا اس پر نظرِ رحمت کرے گا۔" [1]

ایک عبادت گزار شخص پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں پہنچا۔ اس کے بارے میں آپؐ کو بتایا گیا کہ یہ شخص سال بھر عبادت ہی میں گزار دیتا ہے اور اس کے اہل و عیال کا خرچہ اس کا بھائی برداشت کرتا ہے۔

آپؐ نے فرمایا:

---

[1] امالی طوسی۔ جلد ۱۔ صفحہ ۲۶

"اس کا بھائی جو اس کے اہل وعیال کا خرچہ برداشت
کر رہا ہے وہ خدا کے نزدیک اس سے زیادہ مقرب
ہے، وہ اس سے زیادہ عبادت گزار ہے۔"

امیرالمومنینؑ نے ایک گروہ کو مسجدِ کوفہ کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا دیکھا۔ ان کے بارے میں دریافت کیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ یہ "رجال الحق" ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص انھیں کوئی چیز دے دیتا ہے تو یہ کھا لیتے ہیں ورنہ صبر کرتے ہیں۔

امیرالمومنینؑ نے فرمایا:

"بازارِ کوفہ کے کتے بھی ایسے ہی ہیں۔ اگر کوئی ہڈی
مل گئی تو کھا لیتے ہیں ورنہ صبر کرتے ہیں۔"

پھر انھوں نے حکم دیا کہ "رجال الحق" کا گروہ منتشر ہو جائے اور ہر شخص کام کر کے کمائے۔

سعادت اور خوش قسمتی ایسے شخص کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے کہ جو محنت اور کوشش کرنے والا ہو۔ کسی اور کے در پر نہیں جاتی۔

جن لوگوں نے دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے وہ عقل و فکر کے اعتبار سے کوئی زیادہ غیر معمولی نہیں تھے بلکہ ان کی کامیابی کی بنیاد کام اور کوشش اور ثبات و استقامت تھی۔

دنیا کے عظیم لوگ زندگی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے کام کرنے سے جھجکتے نہیں تھے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کے بہت سے شاگرد تیل بیچنے والے، جوتے سینے والے، اونٹ کرائے پر دینے والے تھے۔

"افلاطون" مصر میں سیاحت کے دوران اپنے سفر کا خرچ تیل بیچ کر پورا کرتا تھا۔

مشہور ماہر نباتیات "لینیہ" جوتے سینے والا تھا۔

افسوس کی بات ہے کہ لوگ "قُلی" کو نیچ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ بوجھ اٹھانا ایک شریفانہ کام ہے۔ اگر ایک دن بندرگاہ کے مزدور ہڑتال کر دیں یا کسی شہر کے مزدور ایک دن کام کرنا چھوڑ دیں تو زندگی کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے۔

عالمِ انسانیت کے عظیم پیشوا حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام خود اپنے ہاتھ سے باغات تیار کرتے تھے اور بعد میں بے کس لوگوں کو عطا کر دیتے تھے۔

انھوں نے مدینہ کے گوشہ و کنار میں اپنے بازوؤں کی طاقت سے کئی خیمے بنا کر نصب کیے۔ وہ کام کے سلسلے میں پسینہ بہانے میں ہرگز کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

پیغمبرِ اسلامؐ نے ایسے شخص پر لعنت کی ہے جو معاشرہ پر بوجھ بنا ہوا ہو۔ آپؐ نے اُسے رحمتِ خدا سے دُور قرار دیا ہے۔[1]

ہمارے پانچویں پیشوا امام محمد باقر علیہ السلام سخت گرمی میں بھی اپنے کھیت اور باغ میں جاتے تھے۔ ان کی پیشانی سے پسینہ بہتا

---

[1] فروع کافی جلد ۱۔ صفحہ ۳۴۷

رہتا تھا۔ اور اپنے کارندوں کو ہدایات دیتے جاتے تھے اور خود بھی کام کرتے جاتے تھے۔

ایک دفعہ اُن کے ایک دوست "محمد منکدر" نے اس سلسلہ میں اعتراض کیا۔ اس کا خیال تھا کہ امام محمد باقر علیہ السلام کی جیسی شخصیت کے لیے کام کرنا مناسب نہیں ہے۔

امامؑ نے اس کو جواب دیا کہ:

"کام کرکے کمانا ایک قسم کی عبادت ہے۔
میں اس وسیلہ سے چاہتا ہوں کہ خود کو اور
اپنے اہل وعیال کو تجھ سے اور دوسروں سے
بے نیاز کردوں۔" [1]

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۲۔ صفحہ ۵۲۱

مقصد پر ایمان

مقصد پر ایمان ایک ایسا باطنی محرک ہے کہ انسان خواہ چاہے یا نہ چاہے، وہ ایمان اور یقین اسے مقصد اور ہدف کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ انسان کو اپنی ذات سے بہت زیادہ محبت ہوتی ہے اور یہ محبت ختم ہونے والی نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے اگر انسان کو یہ یقین حاصل ہو جائے کہ اس کی سعادت و کامیابی فلاں کام میں مضمر ہے تو وہ لازمی طور پر اس کام کی طرف بڑھے گا۔

جس شخص کو اپنی صحت و تندرستی عزیز ہے اگر وہ کبھی بیمار ہو جائے تو وہ کڑوی دوا بھی بآسانی پی لیتا ہے۔ خود سر جنوں کے نشتر تلے آجاتا ہے۔

کیوں ——— ؟

کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ کڑوی دوا پی لے اور اس کی عافیت اسی میں ہے کہ اس کے فاسد اعضا کاٹ دیے جائیں۔

غوطہ خور کو اگر یقین ہو کہ سمندر کی تہہ میں قیمتی جواہرات موجود ہیں۔ تو وہ ایک خاص ولولہ اور عشق کے ساتھ خود کو سمندر کی موجوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ لیکن اگر اس کا یہ یقین کمزور ہو تو وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا اور سمندر کی تہہ میں نہیں اُترے گا۔

اسی یقین کے سائے میں انسان اپنے ذہن میں کامیابی اور ھدف و مقصد کو حاصل کرنے کا خیال پختہ کرتا رہتا ہے۔ اسی یقین کے زیرِ سایہ وہ تکلیفوں اور تلخیوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ کانٹوں اور تیروں سے دوستی پیدا کر لیتا ہے اور اُف تک نہیں کرتا۔

کبھی مقصد کو حاصل کرنے کا عشق اتنا ہوتا ہے کہ وہ جان سے گزر جاتا ہے۔ وہ جان و مال کو مقصد پر قربان کر دیتا ہے۔ مسکراتے چہرے کے ساتھ وہ موت کے استقبال کے لیے بڑھتا ہے اور انتہائی مسرّت کے ساتھ وہ ہدف کی راہ میں جان دے دیتا ہے۔ کہنے والے نے کہا ہے کہ ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
اگر مرگش رسد خنداں بمیرد

(میں تجھے مردِ مومن کی علامت بتاؤں۔ اگر موت اس تک پہنچے تو وہ ہنستے ہوئے مرتا ہے)

یہ وہی ھدف پر یقین اور مقصد پر ایمان ہے جو خلا بازوں کو موت کے آستانے تک لے جاتا ہے۔ آسمانوں کے طلسم کو کھولنے اور آسمانی کرّوں اور اجسام کی تسخیر کے لیے وہ جان ہتھیلی پر لیے ہوئے ہر طرح کی کوشش کرتے ہیں۔

چودہ سو سال پہلے "بدر" نامی بیابان میں مسلمانوں کی تعداد

تین سو تیرہ سے زیادہ نہیں تھی۔ جنگی اور دفاعی ساز و سامان بھی ان کے پاس کافی نہیں تھا۔ اور ان کا مقابلہ "قریش" کی مسلح اور طاقتور فوج سے تھا۔ ایک جنگی ماہر کی نظر سے اگر دیکھا جائے تو مسلمانوں کی کامیابی کا امکان بہت ہی کم تھا۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ مسلمانوں کا یہ چھوٹا سا گروہ، ایک طاقتور فوج کو تہس نہس کر کے رکھ دے گا۔

لیکن مادہ پرست لوگوں اور ماہروں کے خیالِ خام کے برخلاف ہدف پر ایمان کی طاقت سے مسلح، اقلیت چند گھنٹوں میں، ایک مادی طور پر مسلح فوج پر فتح یاب ہو گئی۔

اس مختصر اقلیت کی کامیابی اور فتحیابی کا سبب وہی مقصد پر ایمان تھا جس نے ہدف کی راہ میں شہادت اور جان دے دینے کو ان کے لیے آسان بنا دیا تھا۔

اور یہ وہ حقیقت ہے کہ جس کا خود دشمن نے بھی اعتراف کیا ہے۔ کیونکہ جنگِ بدر سے پہلے کافروں کے ایک بہادر فوجی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ مسلمان سپاہیوں کی مادی اور روحانی طاقتوں کا اندازہ لگائے، اور سپہ سالار کو اس سلسلے میں صحیح اطلاع بہم پہنچائے۔

اس نے درست انداز سے تحقیق کی اور یہ رپورٹ دی:

"مسلمان اگرچہ گنتی کے اعتبار سے اقلیت میں ہیں لیکن روحانی طاقت اور اپنے دین کی راہ میں استقامت اور ثابت قدمی کے اعتبار سے بہت قوی ہیں۔ یہ وہ گروہ ہے جس کی پناہ صرف اس کی تلوار ہے۔ جب تک ان میں سے ہر

ایک، تمھارے کم از کم ایک آدمی کو نہ مارے،
مرے گا نہیں۔ جب یہ اپنی تعداد کے برابر تمھارے
لوگوں کو مار ڈالیں تو پھر زندگی میں کیا فائدہ
رہ جائے گا۔"

قیصر کے دربار میں حذافہ

جس سپاہی کو اپنے مقصد پر یقین ہو وہ کسی قسم کی جانبازی اور فداکاری سے جھجکتا نہیں ہے۔ اس کے لیے میدان جنگ اور حجلۂ عروسی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

تاریخِ اسلام میں اس کی واضح مثالیں مل سکتی ہیں۔ بلکہ دنیا کی قوموں کی تاریخ میں بھی اس کی زندہ مثالیں موجود ہیں۔

اسلامی فوج کے ایک بریگیڈ کا کمانڈر، اپنے بریگیڈ سمیت روم کے عیسائیوں کے ہاتھوں قید ہوگیا۔ دشمن کی فوجی عدالت نے تمام مسلمان فوجیوں کو قتل کر دینے کا حکم دے دیا۔ ایسی صورت میں بریگیڈ کے کمانڈر کو یہ پیشکش ہوئی کہ اگر وہ عیسائی ہو جائے تو عدالت اپنی رائے واپس لے لے گی۔

لیکن مسلمانوں کا کمانڈر، مقصد کو اپنی جان سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ظاہری طور پر بھی اسلام چھوڑ دے اور بظاہر عیسائی بن جائے تو دیگر تمام مسلمان فوجی جو جنگ کے میدانوں میں انتہائی بہادری سے لڑے تھے، بودے پڑ جائیں گے اور دشمن کی سازش کے زیر اثر آجائیں گے۔

یہ سوچ کر اس نے انتہائی صراحت کے ساتھ عدالت کی پیشکش کو

ٹھکرا دیا۔ ایسے میں عدالت نے "حذافہ" سے وعدہ کیا کہ اگر وہ عیسائی ہو جائے تو بادشاہ قیصر کی بیٹی سے اس کی شادی کر دی جائے گی اور اس کو اعلیٰ منصب دیے جائیں گے۔ اس نے عدالت کی یہ پیش کش بھی ٹھکرا دی۔

شاہ "قیصر" خود عدالت میں موجود تھا۔ اس نے حکم دیا کہ ایک فوجی کو زیتون کے تیل سے بھری ہوئی ایک گرم دیگ میں ڈال دیا جائے تاکہ "حذافہ" اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ عدالت کا حکم اٹل ہے اور مذاق نہیں ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے فوجی کے گوشت کو ہڈیوں سے الگ ہوتے ہوئے اور اس کے جسم کو تیل میں اوپر نیچے ہوتے ہوئے دیکھا۔ ایسے موقع پر "حذافہ" بہت رویا۔

دشمن نے تصور کیا کہ وہ خوف کے مارے رو رہا ہے۔ لیکن وہ فوراً ان لوگوں کی طرف مڑا اور یہ کہنا شروع کیا۔

"میں اس کے اس انجام پر نہیں رو رہا ہوں۔ میں تو خود اس انجام کے انتظار میں ہوں۔ میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ میرے پاس "اسلام" پر فدا کرنے کے لیے صرف اپنی ایک جان ہے۔ اے کاش کہ میرے بالوں کی تعداد کے برابر میری جانیں ہوتیں اور میں ان سب کو اپنے "دین" پر فدا کر دیتا۔"

سننے والے اس ایمانِ راسخ پر حیرت میں ڈوب گئے اور انھوں نے بہانہ بنا کر اُسے "اسیؔ" فوجیوں سمیت آزاد کر دیا۔ [1]

---

[1] اسد الغابہ جلد ۳ صفحہ ۱۴۳

آج کی سیاست کی دنیا میں ایک مسئلہ "ویتنام" کے نام سے موجود ہے۔ ایک غریب قوم ہے جس کے پاس تیر کمان کی طاقت ہے اور ہدف پر ایمان و اعتقاد ہے۔ اس قوم نے امریکہ کے وسیع اقتصاد اور انتظامیہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ درحقیقت ایک "ویت کانگ" نے امریکہ کے دس لاکھ ڈالر خرچ کروا دیے ہیں۔

صرف ۱۹۶۵ء ہی میں امریکہ نے جنوبی ویتنام (کے ان علاقوں پر جو ویت کانگیوں کے قبضے میں ہیں) اور شمالی ویتنام پر اسی ہزار بم گرائے۔ اور ۱۹۶۶ء میں امریکہ کا اس سلسلے میں پندرہ ارب اسی کروڑ ڈالر کا خرچ ہوا۔ [1]

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بدھ مت کے مذہبی پیشوا خود کو "سائیگان" کے میدانوں میں آگ لگا لیتے ہیں اور ان کی پیشانی پر بل تک نہیں آتا اور وہ مشعل کی طرح جل جاتے ہیں اور دیگر بدھ مت کے پیروکار ان کے گرد مذہبی گیت پڑھتے ہیں۔ یہ سب اس ایمانِ راسخ کے سبب سے ہے اور اسی وجہ سے آج ان کی سرزمینیں مشرق و مغرب کے لیے میدان جنگ بن کر رہ گئی ہیں۔

لیکن ادھر امریکی افسروں اور فوجیوں میں عزم پیدا کرنے کے لیے لازمی ہے کہ

ہر ماہ فنکاروں کا ایک گروہ بہت زیادہ اخراجات کر کے بلایا جائے اور ان کی تاریک زندگی میں رقص اور مادی عیش کا انتظام کیا جائے۔

ویت نام کے فوجی ایک مخصوص مقصد کے لیے لڑتے ہیں۔ ان کا مقصد ظلم کے دور کا خاتمہ اور آزاد ہو کر زندہ رہنا ہے۔

---

[1] اخبار اطلاعات ۱۹۴۷ء

لیکن امریکی فوجی نہیں جانتا کہ وہ کیوں لڑ رہا ہے۔ کیونکہ اس کی سرزمین اور "ویت نام" کی سرزمین کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔

مقصد پر ایمان کی کئی مثالیں ہیں۔ ایمان کی سب سے بڑی مثال وہ ہوتی ہے جس میں جان کی بازی لگادی جائے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید میں بہت واضح طور پر بیان موجود ہے۔

صبر و استقامت

صبر و استقامت، تحمل اور بُردباری، دنیا کے عظیم اور کامیاب لوگوں کا شیوہ ہے۔ صبر انسان کی ایک اعلیٰ فضیلت ہے۔

کبھی صبر اور سُستی، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے اور تقدیر اور ظلم پر راضی رہنے میں اشتباہ ہو جاتا ہے۔

حالانکہ صبر و استقامت۔ سعادت و کامیابی کا ضامن ہے۔ جبکہ سُستی اور کاہلی بدبختی اور بُرے انجام کا سبب ہے۔

اب ہم ان دو ایک دوسرے کی ضد صفات کو مختلف مثالوں کے ذریعے جدا کر کے بتاتے ہیں:

① —— ایک مالی چاہتا ہے کہ اس کے باغ کے احاطے میں اتنے پھول اُگے ہوئے ہوں کہ پورا ماحول خوشبو سے معطّر رہے اور پھولوں کے مختلف رنگ آنکھوں کو خیرہ کریں اور باغ کا ماحول اچھا لگے۔

مالی اگر یہ آرزو رکھتا ہے تو اسے محنت کرنی چاہیے۔ سردی، گرمی برداشت کرنی چاہیے۔ کانٹوں کی چبھن کا عادی ہو جانا چاہیے۔ وقت بہ وقت باغ کا معائنہ کرنا چاہیے۔

ایک عالی ہدف کو حاصل کرنے کے لیے اس طرح کی تکلیفوں کو برداشت کرنے کا نام ہم "صبر" رکھتے ہیں۔

(۲) ——— ایک تاجر چاہتا ہے کہ اسے فائدہ حاصل ہو اور اس کی دولت میں اضافہ ہو ———

اس کے لیے اسے سمندری، خشکی اور ہوائی سفروں کی زحمت برداشت کرنی چاہیے ——— ایک طالب علم بہترین نمبر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یا ایک سیاست دان قوم کے دلوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے تو اس کو بہت زیادہ استقامت اور ثابت قدمی سے اپنے کاموں کو انجام دینا چاہیے ———!

اسی موقع پر حافظ شیرازی کہتے ہیں ؎

صبر و ظفر ہر دو دوستانِ قدیمند
بر اثرِ صبر نوبتِ ظفر آید

(صبر اور کامیابی دونوں ایک دوسرے کے قدیم دوست ہیں۔ صبر کے نتیجے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے)

ممکن ہے کہ کوئی یہ تصور کرے کہ کامیابی کے سبب "استقامت اور ثابت قدمی" کو کامیابی کے دوسرے سبب "کام اور کوشش" کے ساتھ ملا کر بیان کرنا چاہیے تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ان دونوں چیزوں میں فرق ہے۔

ایسے بعض افراد ہوتے ہیں جو کام کی ابتدا میں تو کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جب سختیاں آتی ہیں تو ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ اس اعتبار سے ثابت قدمی اور بردباری کو کام اور کوشش کا پشت پناہ سمجھنا چاہیے۔ اسے کام کو جاری رکھنے کا محرک تصور کرنا چاہیے۔

کامیابیاں سب ایک طرح کی نہیں ہوتیں۔ کبھی کامیابی دیر سے حاصل ہوتی ہے اور کبھی جلد۔ ہرگز یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ تمام کام ایک ہی انداز سے ہو جائیں گے اور ہم تمام کاموں میں بیک وقت کامیاب ہو جائیں گے۔

کاموں میں باہم فرق ہوتا ہے۔ بعض ایسے آسان کام بھی ہوتے ہیں جنھیں مشکل حالات میں انجام دینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ لوگوں کی لیاقت اور استعداد میں بھی فرق ہوتا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لیاقت کے اعتبار سے ایک گروہ کے افراد ایک جیسے ہوں لیکن ان کے ہوش و حواس کے درجہ میں فرق ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شخص کسی کام کو ایک سال میں سیکھتا ہے اور اس کام کی مشکلات کا سال بھر میں عادی ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی اور شخص کو بھی اتنی ہی مدت درکار ہوگی۔

کہتے ہیں کہ "جارج اسٹیفن" نامی ریاضی دان جو "بابائے ریل" کے نام سے مشہور ہوا۔ علم حاصل کرنے میں اس نے بہت سستی سے پیشرفت کی۔ لیکن دنیا کا سب سے پہلا ریلوے انجن اسی کے ہاتھوں بنا۔ مسافروں کو لے جانے والی سب سے پہلی ریل اس نے ۱۸۲۵ میں پیش کی۔

دانشمند لوگ کہتے ہیں کہ:

اعلیٰ ذہانت دو قسم کی ہوتی ہے:

ایک دیر سے حاصل ہونے والی اعلیٰ ذہانت ،
اور دوسری جلد حاصل ہونے والی اعلیٰ ذہانت ۔
اور دنیا کے دانشمندوں کی زندگی کے صفحات اس تقسیم کے قطعی گواہ ہیں ۔

اسی وجہ سے ہم بھی کہتے ہیں کہ :
کامیابی دو قسم کی ہوتی ہے :
ایک دیر سے حاصل ہونے والی کامیابی ،
اور دوسری جلد حاصل ہونے والی کامیابی ۔

اگر کامیابی دیر سے حاصل ہو رہی ہو تو کام ہی ترک کر دینا نہیں چاہیے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ کامیابی محال اور ناممکن ہے ۔

ایک مسلمان اور بزرگ دانشمند اور عالم " ابوجعرانہ " مستقل مزاجی اور ثابت قدمی میں مشہور ہیں ۔ وہ فرماتے ہیں کہ :

" میں نے مستقل مزاجی " بجّو " نامی ایک کیڑے سے سیکھی ہے ۔ میں دمشق کی جامع مسجد میں ایک صاف شفاف ستون کے پاس بیٹھا ہوا تھا ۔ میں نے دیکھا کہ یہ کیڑا پالش کیے ہوئے اس ہموار پتھر پر اوپر چڑھنا چاہتا ہے اور ستون کے اوپر جو چراغ رکھا ہے اس کے کنارے بیٹھنا چاہتا ہے ۔ میں رات کے ابتدائی حصے سے صبح کے قریب تک اس ستون کے پاس بیٹھا رہا اور اس کیڑے کی اوپر جانے کی کوشش کو دیکھتا رہا ۔ میں نے دیکھا کہ یہ

زمین سے سات سو مرتبہ ستون کے درمیانی حصے تک پہنچا۔ جب ہمت ختم ہو جاتی تھی تو زمین پر گر پڑتا تھا۔ اس لیے کہ ستون بہت ہموار تھا۔ اس کے قدم جمتے نہیں تھے۔ اور وہ بیچ راستے میں لڑکھڑا جاتا تھا۔"

"میں اس کیڑے کے غیر معمولی اور فولادی ارادے کو دیکھ کر حیرت میں ڈوب گیا۔ میں اٹھا۔ وضو کیا اور نماز پڑھی۔ نماز کے بعد جب میں نے اس کیڑے پر نگاہ ڈالی تو کیا دیکھا کہ وہ اپنی مستقل مزاجی کے نتیجے میں اپنی مراد پا چکا ہے اور چراغ کے کنارے بیٹھا ہے۔"

شیریں سخن شاعر کے بقول ؎

پافشاری و استقامت میخ ۔۔۔ سزواز عبرت بشر گردد
بر سرش ہر چہ بیشتر کوبی ۔۔۔ پافشاریش بیشتر گردد

(استقامت اور ثابت قدمی ایک کیل ہے۔ انسان کو اس سے عبرت پکڑنی چاہیے۔ کیل کو جتنا ٹھونکیں گے وہ اتنی زیادہ مضبوطی سے جم جائے گی۔)

علم و ہنر حاصل کرنے میں ثابت قدمی کا اثر

"ڈیموستھن" امریکہ کا ایک بڑا مقرر ہے۔ اسے فن تقریر میں مسلسل کئی بار شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اٹک جایا کرتا تھا۔ اس نے اپنے فن تقریر کو پایۂ تکمیل

تک پہنچانے کے لیے تہہ خانے میں مشقیں شروع کیں۔

کبھی وہ اپنے سر اور چہرے کو آدھا مونڈ دیتا تھا اور اس طرح اپنی شکل مضحکہ خیز بنا لیتا تھا۔ اس طریقے سے وہ خود کو مجبور کرتا تھا کہ کئی مہینے گھر میں بیٹھا رہے اور تقریر کی مشقیں کرتا رہے۔

"سکاکی" نامی ساتویں صدی کے مسلمان دانشمند کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ اس نے تیس سال کی عمر میں علم حاصل کرنا شروع کیا۔ اگرچہ کہ اس کے استاد اس کے کامیاب ہو جانے سے مایوس اور ناامید تھے لیکن وہ خود ایک عجیب ولولے اور جذبے کے ساتھ علم حاصل کرنے میں مشغول رہا۔

استاد نے اس کی ذہانت کا اندازہ لگانے کے لیے ایک سادہ سا مسئلہ پیش کیا۔ یہ شافعی فقہ کا ایک مسئلہ تھا۔

استاد نے کہا کہ:

"کتے کی کھال کو ٹٹنے سے پاک ہو جاتی ہے۔"

"سکاکی" نے اس جملے کو بہت دہرایا اور وہ یاد کر کے سنانے کے لیے شوق سے تیار تھا۔

اس کے اگلے دن استاد نے شاگردوں کے انبوہ کے درمیان "سکاکی" سے پوچھا کہ کل کا مسئلہ کیا تھا؟ "سکاکی" بے ساختہ بول پڑا:

"کتے نے کہا کہ استاد صاحب کی کھال کو ٹٹنے سے پاک ہو جاتی ہے۔"

یہ سن کر شاگردوں اور استاد کی ہنسی کی آواز بلند ہوئی لیکن اس بالغ اور زیادہ عمر والے نئے شاگرد کی روح اتنی توانا تھی کہ آزمائش میں اپنی اس

ناکامی پر اس نے ہار نہیں مانی۔ وہ پورے دس سال تک اسی راستے پر چلتا رہا۔ لیکن ابھی تک عمر زیادہ ہونے کے سبب سے اس کی علم حاصل کرنے کی رفتار اطمینان بخش نہیں تھی۔

ایک دن وہ سبق یاد کرنے کے لیے بیابان کی طرف گیا ہوا تھا۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ بارش کے پانی کے قطرے پتھر کی ایک چٹان پر گر رہے ہیں اور پتھر پر پانی کی وجہ سے نشان بن گیا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر اس کو عبرت ہوئی۔ اس نے خود سے کہا:

"میرا دل اس پتھر سے زیادہ سخت تو نہیں ہے
اگر علم کے قطرے بارش کے قطروں کی طرح مسلسل
میرے دل پر گرتے رہیں تو یقیناً مجھ پر بھی اس
کا کچھ نہ کچھ اثر ہو گا۔"

وہ شہر واپس آیا اور بہت زیادہ ولولے کے ساتھ علم حاصل کرنے میں مشغول ہو گیا۔ آخر کار استقامت اور ثابت قدمی کی وجہ سے وہ عرب کی ادبی دنیا کا ایک انتہائی ممتاز شخص قرار پایا۔ عربی علوم میں اس نے ایک کتاب چھپوائی جو مدتوں تک اسلامی درس گاہوں میں بنیادی کتاب کی حیثیت سے پڑھائی جاتی رہی۔

چشمہ اور پہاڑ

چشمہ، پہاڑوں سے نیچے کی طرف بہتا ہے۔ راستے میں چٹانیں اور دیگر بہت سی رکاوٹوں کا اسے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی گھنٹوں تک پانی آگے نہیں بڑھ پاتا۔ رکاوٹیں سختی سے اُسے روکنا چاہتی

ہیں، لیکن پھر بھی پانی اپنی مسلسل کوشش سے باز نہیں آتا۔ وہ ہر لمحہ رکاوٹوں کی طاقت کو کم کرتا رہتا ہے اور آخر کار کہیں نہ کہیں سے اپنے لیے راستہ بنا ہی لیتا ہے۔

یہ مثال ایک توجہ کے قابل حقیقت ہے۔ مرحوم ملک الشعراء بہار نے اس بات کو نظم کیا ہے اور کہا ہے کہ:

جدا شد یکی چشمہ از کوہسار
برہ گشت ناگہ بسنگی دچار
بہ نرمی چنین گفت با سنگِ سخت
کرم کردہ راہی دہ ای نیکبخت
دلی سنگ چون خوگران بود سر
زدش سیلی و گفت دور اے پسر
نجنبیدم از سیل دریا گرای
کہ اے تو، کہ پیش تو جنبم زجای
نشد چشمہ از پاسخ سنگ سرد
بکندن درایستاد و ابرام کرد
بسی کند و کاوید و کوشش نمود
کزیں سنگ خارا رہی برگشود
زکوشش بھر چیز خواہی رسی
بھر چیز خواہی کماہی رسی

(ایک چشمہ پہاڑ سے نکلا۔ راستے میں اچانک ایک پتھر آگیا

اس نے سخت پتھر سے نرمی سے کہا کہ اے نیک بخت
برائے کرم کچھ راستہ دے دو۔ لیکن چونکہ پتھر کو سختی
کی عادت تھی اس لیے اس نے ایک تھپیڑ مار کر کہا کہ
دُور ہو جا، سمندر کا سیلاب بھی آیا ہے تو میں اپنی جگہ
سے نہیں ہلا ہوں۔ تو آخر کیا ہے کہ میں تیرے لیے اپنی
جگہ سے ہٹوں۔ چشمہ پتھر کے اس جواب سے مایوس نہیں
ہوا۔ وہ کھڑا رہا اور دباؤ ڈالتا رہا۔ اس نے بہت
کوشش کی اس سخت پتھر میں سے راستہ نکالے۔ کوشش
کرنے سے تم ہر چیز حاصل کر لوگے اور جیسی چیز چاہو گے
ویسی ہی پا لوگے)

جو لوگ معاشرتی امور اور فلاحی کاموں میں مشغول ہوتے ہیں ان کو دوسروں سے زیادہ صبر و حوصلہ اور ثبات و استقامت کی ضرورت ہوتی ہے ایسے لوگ صبر اور بردباری کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔

انگلستان کے ایک فلسفی کا یہ عقیدہ تھا کہ کوئی بھی شخص کسی بھی کام کو انجام دے سکتا ہے۔ اسی اصول کی بنیاد پر وہ ایک ماہر شہسوار کے ساتھ دو گھوڑوں پر سفر کے لیے نکلا۔ راستے میں وہ ایک مختصر سی دیوار تک پہنچے۔ ماہر شہسوار نے گھوڑے کو ایک تھپکی دی اور دیوار پھلانگ لی۔ اس فلسفی نے بھی اسی طرح کرنا چاہا لیکن کامیاب نہیں ہوا اور گھوڑے سے زمین پر گر پڑا وہ زمین سے اٹھا۔ دو مرتبہ اسی طرح پھر ہوا۔ آخر کار وہ بھی گھوڑے سمیت دیوار پھلانگنے میں کامیاب ہو گیا۔

"اوڈوبن" امریکہ کا مشہور ماہر حیوانیات تھا۔
اس نے مختلف پرندوں کی دو سو تصویریں کاغذ پر بنائی تھیں۔ اسے جب سفر درپیش ہوا تو اس نے تمام تصویریں ایک صندوق میں بند کر دیں۔
اس کی غیر موجودگی کے زمانے میں چوہوں نے ان تمام تصویروں کو کتر ڈالا۔ واپس آکر اس نے جب صندوق کھولا تو اپنی زحمتوں کو برباد حالت میں دیکھا۔ بہت غمگین ہوا۔ لیکن پھر اس نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور تمام تصویریں نئے سرے سے بنا ڈالیں۔

"کارلائل" نے فرانس کی تاریخ لکھی تھی۔
اس کے ایک دوست نے اس سے فرانس کی تاریخ کی جلد اوّل مستعار لی۔ کتاب کا یہ واحد نسخہ رہ گیا تھا۔ لیکن وہ بھی اس دوست کے خادم کی غلطی کی وجہ سے جل گیا۔
پھر "کارلائل" نے انتہائی صبر و استقامت کے ساتھ پوری کتاب از سرِ نو لکھ دی۔

"ہاروے" نے یہ دریافت کیا تھا کہ:
"بدن میں خون گردش میں رہتا ہے"
وہ آٹھ سال تک آزمائش میں مشغول رہا تب کہیں جا کر اُسے اپنے نظریہ پر یقین و اطمینان پیدا ہوا۔
پھر اس نے اپنے نظریے کو سادہ دلیلوں کے ساتھ پیش کیا ——— لیکن ہر طرف سے مخالفت کی آواز بلند ہوئی۔

ایک گروہ نے اسے مجنون اور دیوانہ قرار دیا۔ اس کے
دوستوں نے اس سے تعلق ختم کر دیا۔
لیکن وہ انتہائی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی
سے اپنی رائے کا دفاع کرتا رہا۔
آج اس کی یہ دریافت ——————
سائنسی علوم کی مسلّم اور مانی ہوئی بات شمار ہوتی ہے۔

یک سُوئی

کامیابی کے اسباب میں سے ایک یکسوئی ہے۔ فکر کو ایک ہی نقطہ کی طرف لگائے رکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہنی دباؤ ایک ہی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اور اس دباؤ کے آگے راستے کی سخت سے سخت رکاوٹ بھی جم نہیں سکتی اور اُکھڑ جاتی ہے۔

کام میں یکسوئی کا وہی کردار ہوتا ہے جو کسی بوجھ کو اٹھانے میں "لیور" کا ہوتا ہے۔ لیور کا اصول یہ ہے کہ طاقتیں ایک نقطے پر جمع ہو جاتی ہیں اور "لیور" ایک مناسب زور لگا کر بڑے اور بھاری جسم کو بلند کر دیتا ہے اور اٹھا لیتا ہے۔ اسی طرح فکر کو ایک ہی مرکز پر لگا دینے سے بہت سی مشکلات انسان کے سامنے سے اٹھ جاتی ہیں۔

ہمارے ذہن و بدن کی کارکردگی بارش کے قطروں کی طرح سے ہے اگر وہ ایک نقطہ پر جمع ہو جائیں تو چھوٹا سا سمندر تشکیل دے دیتے ہیں۔ لیکن اگر

منتشر اور پراگندہ ہو جائیں تو زمین میں غائب ہو جاتے ہیں اور کچھ نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔

آپ سب نے مشرق کے انتہائی ممتاز شخص "شیخ بہائی" کے متعلق سُنا ہوگا۔ انھیں بہت سے مادّی اور طبیعی، ریاضی کے، اور اسلامی علوم میں مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے بہت سے علوم میں اپنی گراں قدر یادگار کتابیں چھوڑی ہیں۔

وہ کہتے ہیں:

"میں نے بہت سے نامور اور مختلف علوم و فنون میں ماہر دانشوروں سے بحث کی ہے۔ اگرچہ کہ ان کی معلومات ہر علم میں وسیع تھیں۔ لیکن بحث میں مجھے کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ لیکن جب بھی میں نے کسی خاص فن کے اسپیشلسٹ سے بحث کی ہے جس نے اپنی تمام صلاحیت ایک ہی مخصوص شعبے میں لگا رکھی تھی تو میں بُری طرح ہارا ہوں۔ کیونکہ میری فکری اور دماغی طاقت اس شعبے میں اس کی نسبت کم تھی اور کوئی نہ کوئی پہلو مجھ سے مخفی رہ گیا تھا۔"

مشکلات کو حل کرنے کے سلسلے میں عقلی قوتیں سورج کی شعاعوں کی طرح سے ہیں۔ اگر عدسہ کے ذریعے سورج کی شعاعیں ایک نقطے پر مرکوز کر دی جائیں تو اپنے سامنے کی چیز کو جلا ڈالیں گی۔ بصورتِ دیگر منتشر ہونے والی سورج کی شعاعیں کسی چیز پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں کرتیں۔

اسی طرح انسان کی فکر کی شعاعیں ایک ہی نقطے پر جب تک مرکوز نہ ہوں وہ رکاوٹوں کو ہٹا نہیں سکتیں۔ اور موضوع کے مختلف پہلو روشن نہیں ہو پاتے۔

تجربہ کار اساتذہ ہمیشہ شاگردوں کو شوق دلاتے ہیں کہ ہر موضوع کا باریک بینی سے مطالعہ کریں۔ آپ کو ضرور معلوم ہوگا کہ "باریک بینی" کا مطلب ہی یہ ہے کہ ذہنی صلاحیتیں ایک ہی جانب مرکوز ہوں۔ جتنی بھی دریافتیں ہیں وہ "باریک بینی" اور دقتِ نظر کا نتیجہ ہیں۔

معاشرے کے سرگرداں (حیران و پریشان) افراد

ہم میں سے بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی زندگی کا کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ ایسے سمندری جہاز یا ہوائی جہاز کی طرح گھومتے رہتے ہیں جس میں سمت کی رہنمائی کے لیے قطب نما نہ لگا ہو۔ ایسا جہاز سمندر میں چھپے ہوئے پہاڑوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایسا ہوائی جہاز آخر کار گر پڑتا ہے۔

بغیر کسی لائحہ عمل اور پروگرام کے زندگی گزارنے والے افراد، یا حالات کے پہاڑوں سے ٹکرا کر ناکارہ ہو جاتے ہیں یا عدم اور نابودی کے درّہ میں گر پڑتے ہیں۔

بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کا لائحہ عمل اور پروگرام تو ہوتا ہے لیکن وہ زندگی میں منزل مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں پسپائی اختیار کر لیتے ہیں اور کسی دوسرے راستے پر چلنے لگتے ہیں۔ کامیاب شخص وہی ہے جو منزل مقصود تک پہنچنے سے پہلے راستے کو نہ چھوڑے۔ کسی اور کام میں مشغول

نہ ہو جائے۔ کیونکہ راستہ اگرچہ لمبا ہو لیکن مسلسل چلتے رہنے سے آخر کار ختم ہو ہی جاتا ہے۔

مستعدی اور تیاری کی صفت ہونے کے باوجود بعض افراد کی پسماندگی کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کے مزاج میں یکسوئی نہیں ہوتی۔ اور تلوّن (رنگارنگی) ہوتا ہے۔ وہ اس شاخ سے اس شاخ تک بار بار اُڑتے رہتے ہیں مختلف شعبوں میں باری باری قدم رکھتے ہیں۔ ابھی ایک کام مکمل نہیں ہوتا کہ وہ کسی اور کام کو اختیار کر لیتے ہیں۔

ایسے لوگ چاہتے ہیں کہ ہر فن مولا ہو جائیں لیکن وہ کسی کام میں بھی ماہر نہیں ہو پاتے۔

فطرت نے ہمیں خوب درس دیا ہے۔

اگر ہم کسی پودے کو بار بار زمین سے اُکھاڑ کر مختلف جگہوں پر لگائیں تو آخر کار وہ پژمردہ ہو جاتا ہے اور سوکھ جاتا ہے۔ لیکن زمین میں ایک ہی جگہ لگا ہوا پودا مسلسل پھلتا پھولتا رہتا ہے۔

"تذبذب" یکسوئی کا فقدان اور فکر کے پودے کو جا بجا تبدیل کرنا پریشانی کا سبب ہوتا ہے۔ فکر کا پھلنا پھولنا ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ:

انتہائی ذہین لوگوں کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے افکار کو ایک نقطے پر مرکوز کر سکتے ہیں۔

تمام کاموں کو اختیار کر لینا، ذاتی نقصانات بھی رکھتا ہے اور اس سے معاشرے کو بھی شدید نقصان پہنچتا ہے۔ کبھی اس کے نتیجے میں ایک ملک کے اقتصاد اور اس کی ثقافت کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ ایک عجیب بدنظمی سی

پیدا ہو جاتی ہے جس کی اصلاح بہت مشکل سے ہو پاتی ہے۔

"یوفون" کہتا تھا کہ:

"انسان کے ذوق اور اس کی فطری صلاحیت
کا مطلب ہی یہی ہے کہ انسان اپنے
ہوش و حواس کو ایک نقطے پر مرکوز
کر دے۔"

"نیوٹن" سے پوچھا گیا کہ:

"آپ اتنی زیادہ چیزیں کس طرح دریافت کر پائے؟"

تو اس نے جواب دیا کہ:

"ان چیزوں میں مستقل غور کرنے سے۔"

وہ ایک موضوع پر اتنا زیادہ غور کرتا تھا کہ وہ موضوع اس کے لیے روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتا تھا۔

آج کے ترقی یافتہ تمدن کی ایک بات یہ ہے کہ اسپیشلسٹ اور کسی فن میں ماہر استادوں کو تیار کیا جاتا ہے خصوصی مہارت (Specialization) کے بغیر آجکل چارہ نہیں ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ترقی کا قافلہ ایک جگہ جا کر رک جائے گا۔

نظم وضبط

نہ صرف یہ کہ نظم وضبط عظیم لوگوں کی کامیابی کا ایک راز ہے ، بلکہ کائنات کا عالیشان محل بھی اسی بنیاد پر قائم ہے۔ اگر نظام شمسی برقرار ہے بسبب سورج کے گرد باقاعدہ گھوم رہے ہیں اور صدیوں سے اس نظام میں کوئی خلل نہیں پیدا ہوا ہے تو یہ اسی وجہ سے ہے کہ نظام شمسی کی بنیاد نظم وضبط پر ہے۔

کائنات کے بہت بڑے اجسام سے لے کر اس کے ناچیز ذرہ "ایٹم" تک تمام موجودات میں نظم وضبط کا خیال رکھا گیا ہے۔ دنیا کی تمام موجودات اسی ناچیز ذرّے سے تشکیل پاتی ہیں۔ ایک حیرت انگیز نظام جاری ہے اور یہی نظام کائنات کے دیگر تمام نظاموں میں بھی موجود ہے۔ ہر نظام میں یہی ناچیز ذرّات ملیں گے۔

ان ایٹموں میں سے ہر ایک کا ایک مرکز ہوتا ہے جسے "پروٹون" کہتے ہیں۔ اور بہت سے "الیکٹرون" سیاروں اور چاندوں کی طرح سے ایک

خاص ترتیب کے ساتھ مرکز کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔

ایک بڑے مسلمان عارف کے بقول:

"آپ ہر ذرّہ کا دل چیریں گے تو اُس کا
سورج درمیان میں دیکھیں گے۔"

کائنات ہمارے لیے ایک بہترین رہنما ہے۔ زندگی اور اس کے دوام و ثبات کی وجہ اور کامیابی کے سبب کو اس سے معلوم کرنا چاہیے۔ یہ کائنات ہمیں بتاتی ہے کہ:

"میری بقا کا راز یہی نظم و ضبط ہے جسے
میرے بنانے والے نے مجھ میں قائم کر
دیا ہے۔"

اگر کسی ملک کے علمی مراکز میں گڑبڑ ہونے لگے، اگر ملک کی تجارت کا حساب کتاب بگڑ جائے۔ اگر طلب و رسد (Demand and Supply) کا توازن خراب ہو جائے، اگر ملک کی انتظامیہ فاسد ہو جائے، اگر فوجی خودسری پر آمادہ ہو جائیں تو اس ملک پر فاتحہ پڑھ دینی چاہیے۔

جب امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام ابن ملجم کی تلوار سے زخمی ہوئے تو آپؑ نے اپنے عظیم بیٹوں کو جو سب سے پہلی وصیت اور سفارش کی وہ خدا کی نافرمانی سے پرہیز کے بعد نظم و ضبط ہی کی تھی:

"اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ وَنَظْمِ
اَمْرِکُمْ۔"

"میں تمھیں خدا کی نافرمانی سے پرہیز اور (زندگی
میں) نظم وضبط کی وصیت کرتا ہوں۔" [1]

نظم وضبط کی ایک علامت یہ ہے کہ ہم اپنے روز وشب کو اپنی ضرورتوں کے مطابق تقسیم کرلیں۔ زندگی ہر ضرورت اور کام کو اس کے وقت پر پورا کرنے کا نام ہے۔

ہمیں زندگی کی اس بنیاد کو مزید محکم بنانا چاہیے۔ ہمیں بدنظمی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ کیونکہ بدنظمی شائستگی کو ختم کردیتی ہے اور ہر قسم کی استعداد اور صلاحیت کو برباد کرکے چھوڑتی ہے۔

پرہیزگاروں کے پیشوا علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"ایک مسلمان شخص کو اپنے روز وشب کے اوقات
کے تین حصے بنانے چاہئیں۔ ایک حصہ خدا کی
عبادت کے لیے۔ ایک حصہ معاش اور زندگی
کے اخراجات حاصل کرنے کے لیے۔ اور ایک حصہ
ان نفسانی لذتوں کو حاصل کرنے کے لیے جن کے
بغیر مادی زندگی میں چارہ نہیں ہے۔" [2]

اگر ماضی میں اور ہماری زندگی کے ایک حصے میں نظم وضبط نہیں تھا تو کیا باقی ماندہ عمر میں ہم نظم وضبط سے استفادہ کرسکتے ہیں ــــ؟!

---

[1] نہج البلاغہ۔ خط نمبر ۴۷

[2] کلماتِ قصار۔ نہج البلاغہ نمبر ۳۹۰

یقیناً کر سکتے ہیں ——— !

کیونکہ زندگی کے تین دور (بچپن، جوانی اور بڑھاپا) ایک ایسی کشتی کے تین طبقے ہیں جنھیں ایک بٹن دبانے سے ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایک طبقہ کو نقصان پہنچ جائے تو اسے جدا کیا جا سکتا ہے۔

کامیاب شخص وہی ہے جو اپنی عقل و خرد کی طاقت سے زندگی کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے جدا کر سکتا ہو اور ہر ایک کے لیے الگ حساب کھول سکتا ہو۔

انسان کے لیے یہ انتہائی بدبختی کی بات ہے کہ وہ اپنے موجودہ امکانات سے استفادہ کرنے کی بجائے اپنے ماضی پر افسوس کرتے رہنے میں وقت ضائع کرے اور زندگی کے اگلے حصے کو منظم کرنے سے غفلت برتے۔

ایک لائق اور شائستہ وزیر اپنے ساتھیوں کے ساتھ حکومت کا انتظام بہت اچھا چلاتا تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ ان تمام کاموں کو آپ کیسے انجام دیتے ہیں؟

تو اس نے جواب دیا کہ:

"آج کا کام میں کل پر نہیں چھوڑتا۔ کسی کام میں تاخیر کو میں مناسب نہیں سمجھتا۔"

دفاتر اور کارخانوں میں بورڈ وغیرہ پر یہ لکھا ہوا ملتا ہے کہ:

"وقت سونا ہے۔"

یہ دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوتا ہے کیونکہ وقت کی اہمیت سونے سے کئی گنا زیادہ ہے اور یہ اسی صورت میں ہے جب ہر کام کو اس کے وقت پر کیا جائے۔

تدریجی ارتقاء

ہمیں کام کا آغاز چھوٹے پیمانہ پر کرنا چاہیے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اسی جگہ بیٹھے رہ جائیں۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم تھوڑی سی ہمت کے ساتھ کام شروع کریں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ——————

ہم لمبا اور بڑا پروگرام تو بنائیں اور بلند اور عالی ہمت کے ساتھ اپنا کام شروع کریں۔ لیکن پورے پروگرام پر ایک ساتھ جلدی سے عمل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے آگے بڑھتے رہیں اور اپنے اعلیٰ مقصد کو رفتہ رفتہ جامۂ عمل پہنائیں۔

ہم بڑا پروگرام کیوں بنائیں ؟!

اس لیے کہ جو لوگ بلند فکر اور اعلیٰ ذہانت رکھتے ہیں وہ اپنی ہمت

کو چھوٹے سے دائرے میں محدود نہیں کر سکتے۔ وہ ایک مقصد حاصل کرنے کے بعد دوسرے مقصد کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے کام کے آغاز ہی سے بڑا پروگرام سوچ لینا چاہیے۔

نفسیاتی اعتبار سے بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ انسان جب تک خود کو بڑے مقصد کے لیے آمادہ نہ کرے اس وقت تک وہ منزلِ مقصود کو پا نہیں سکتا اور کبھی کبھی تو وہ آدھا مقصد بھی حاصل نہیں کر پاتا۔

تنگ نظر لوگ اپنی موجودہ حالت پر راضی رہتے ہیں اور اسی حالت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن بلند نظر رکھنے والے افراد اعلیٰ خیالات کے ساتھ کام شروع کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی حالت کو بہتر بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

"سعدالدین تفتازانیؒ" ان اشخاص میں سے ہیں جنھوں نے اسلام میں فن بلاغت کی بنیاد رکھی۔ ایک دن انھوں نے چاہا کہ اپنے بیٹے کی ہمت کا اندازہ کریں انھوں نے پوچھا کہ:

"علم حاصل کرنے سے تمھارا مقصد کیا ہے؟"

تو اس نے جواب دیا کہ:

"میری پوری کوشش یہی ہے کہ میں علمی لحاظ سے
آپ کے مرتبہ تک پہنچ جاؤں۔"

وہ، اپنے بیٹے کی فکر کی اس کوتاہی سے ملول ہوئے انھوں نے افسوس بھری آواز میں کہا کہ

"اگر تمھاری ہمت اتنی ہی ہے تو علم کے آدھے مرتبے
بھی حاصل نہیں کر پاؤ گے۔ تمھاری فکر کا اُفق

بہت مختصر ہے۔ میں سعدالدین تمھارا باپ ہوں
میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے علم کی شہرت
سُنی تھی اور ان کی یادگار حدیثوں کے ذریعے سے
ان کے علمی مرتبے کا معتقد تھا۔ علم حاصل کرنے
کے ابتدائی زمانے ہی سے میری پوری کوشش یہ
تھی کہ میں دنیا کے اس عظیم شخص کے علمی مرتبہ تک
پہنچ جاؤں۔ اتنی بلند ہمتی اور فکر کی جسارت کے
باوجود میں علم کے اس درجہ تک پہنچ پایا ہوں جس
کا تم مشاہدہ کر رہے ہو۔ اور علم کا یہ درجہ اس عظیم
رہنما کے علمی مقام کے سامنے کوئی حیثیت نہیں
رکھتا۔ تمھاری ہمت آج اگر اتنی کم ہے تو تمھیں
انتہائی کم علم حاصل ہو سکے گا اور تم تعلیم چھوڑ بیٹھو گے۔"

اس لیے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اپنے دل میں اونچے پیمانے کی ہمت پیدا کریں ؎

ہمت بلند دار کہ مردان روزگار
از ہمتِ بلند بجائی رسیدہ اند
(ہمت بلند رکھو کیونکہ دنیا کے بڑے اور عظیم لوگ
بلند ہمت ہی کی وجہ سے کسی مقام تک پہنچے ہیں)

مولانا رومی کہتے ہیں کہ ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست تا کہ جوشد آب از بالا و پست

(اگر تشنگی اور پیاس لگی رہے تو پیٹ میں موجود پانی
اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر جوش کھاتا رہے گا)

کام کا آغاز چھوٹے پیمانہ سے کیوں کریں؟!

کام کا ابتدائی زمانہ ایک آزمائشی مرحلہ ہوتا ہے۔ ابھی تک کام کے فوائد و نقصانات واضح طور پر سامنے نہیں آئے ہوتے۔ ہوسکتا ہے کہ مقصد کے راستے میں کچھ رکاوٹیں ہوں اور ان کو راستے سے ہٹانے میں بہت لمبا زمانہ درکار ہو۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم نے ایسا راستہ اختیار کر رکھا ہو جو کہ مقصد تک نہیں جاتا۔ ہوسکتا ہے کہ کام کا پروگرام بنانے میں ہم سے بہت سے اشتباہات ہو گئے ہوں۔ اس لیے اگر ہم کام کو بڑے پیمانے پر شروع کریں تو غلط راہ سے درست راستے پر آنا بہت مشکل ہو جائے گا۔

ہم مشرق کے لوگوں کا ایک عیب یہ بھی ہے کہ ہم کام کو بہت طمطراق اور شان و شوکت کے ساتھ بڑے پیمانے پر شروع کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم کامیابی بھی حاصل نہ کر پائیں اور واپس آنے کا راستہ خود پر بند بھی کر لیں۔ نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ عمر اور سرمایہ بھی ضائع ہوا اور بددلی اور کم ہمتی بھی پیدا ہو گئی اور ہم جہاں تھے وہیں کے وہیں رہے۔

ناصر الدین شاہ کی یادداشتوں میں ہم پڑھتے ہیں کہ وہ یورپ کے سفر پر گئے۔ لندن گئے تو برطانیہ کی ملکہ سے ملاقات کی۔

انھوں نے ایران میں انگلش بینک کے کامیابی سے چلنے کی وجہ دریافت کرنا چاہی اور کہا:

"جب ایران کے دارالحکومت میں اس بینک نے
اپنا شعبہ کھولا تو اس کے عملہ میں صرف ایک منیجر
ایک اکاؤنٹنٹ اور ایک چپراسی شامل تھے اور
اس بینک نے مختصر سرمائے سے کام کا آغاز کیا
لیکن تھوڑے سے عرصے میں بہت کامیابی حاصل ہوئی۔"

ملکہ نے اپنے مہمان کے جواب میں کچھ اس طرح کہا کہ :

"برطانیہ کی قوم اپنی کامیابی کے راز دوسری قوموں کو
نہیں بتاتی ہے۔ لیکن میں آپ کے احترام کو ملحوظ
رکھتے ہوئے ایک نکتہ بتا دیتی ہوں۔ ہم مغرب
کے لوگ، خاص طور پر برطانیہ کے لوگ ہمیشہ کام کو
چھوٹے پیمانہ سے شروع کرتے ہیں۔ تاکہ اگر کوئی
فائدہ حاصل نہ ہو تو واپس لوٹنے کا راستہ ہمارے
لیے کھلا رہے۔ اور ہم تھوڑے سے نقصان
کو برداشت کر کے اپنا راستہ تبدیل کر دیں۔ اور
اگر ہمیں فائدہ حاصل ہو تو ہم فوراً اپنی موجودہ حالت
کو وسعت دے دیتے ہیں۔ اس خصوصیت میں
ہم لوگ آپ مشرقی لوگوں کے بالکل برعکس ہیں۔"

ہم نے خود لوگوں کو اس طرح سرمایہ لگاتے ہوئے دیکھا ہے کہ اس بنیادی نکتے کا لحاظ نہ کر کے انھوں نے بہت نقصانات اٹھائے۔ اور وہ بحرانوں اور اقتصادی پیچیدگیوں میں مبتلا ہو گئے۔

اب ہم ایک نظر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی کامیابی پر ڈالیں۔ آج ساٹھ کروڑ مسلمان آپ ﷺ کی پیروی پر فخر کرتے ہیں۔ جبکہ دعوتِ اسلام کے ابتدائی دنوں میں مسلمانوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔

آپ ﷺ کا کام اور پروگرام اتنا بڑا تھا کہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اس کا دخل تھا۔ خواہ وہ سیاسی شعبہ ہو یا اقتصادی۔ یا اخلاقی یا کوئی اور۔ اور آپ ﷺ کا پروگرام ہر لحاظ سے مکمل تھا۔

ابتدائی دنوں میں آپ ﷺ نے لوگوں سے "کلمۂ شہادتین" (یعنی خدا کے ایک ہونے اور اپنے رسول ﷺ ہونے) کے اقرار کے علاوہ کچھ اور نہیں چاہا۔

آپ ﷺ کا عظیم کام چھوٹے پیمانے پر شروع ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے ماحول کو رفتہ رفتہ سازگار کیا اور ایک ایک کر کے انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں احکامات جاری کیے۔ دنیا کے لوگوں کو آپ نے زندگی گزارنے کا ایسا پروگرام دیا کہ ان کی زندگی کا راستہ بدل کر رہ گیا۔

اندھی تقلید سے اجتناب

کامیابی کا ایک راز یہ ہے کہ ہم بے سوچے سمجھے دوسروں کی پیروی سے پرہیز کریں۔ اور اس طرح اپنی فطرت کے خلاف اعلان جنگ نہ کریں۔

ہم کو چاہیئے کہ ہم دوسروں کے ایسے کام کو شروع نہ کر بیٹھیں جس کی صلاحیت ہم میں نہیں ہے۔ ہم کو یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ مطلق طور پر ہر اعتبار سے دوسروں جیسا بننے کا رجحان زندگی میں ناکامی کا باعث بنتا ہے۔

اصولاً جن لوگوں کی شخصیت میں کچھ کمی رہ جاتی ہے اور وہ بعض اوقات اس راستے میں ناکامی اور محرومی کا سامنا کرتے ہیں۔ تو یہ اسی وجہ سے ہے کہ وہ اپنی صلاحیت کا اندازہ لگائے بغیر آگے بڑھتے ہیں۔ حالانکہ انھیں چاہیئے تھا کہ وہ کسی اور راستے پر چل کر اپنی شخصیت میں موجود کمی کو پورا کرتے۔

غرور میں مبتلا ہونا، دوسروں سے حسد کرنا یا حقائق سے واقفیت کی کمی۔ یہ وہ باتیں ہیں جو انسان کو دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرنے پر

اکساتی ہیں، حالانکہ وہ کام کے آغاز ہی سے اس کے انجام سے غافل ہوتے ہیں۔
متقیوں کے مولا حضرت علی علیہ السلام نے لوگوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

"لوگ یا تو عالم ہیں یا طالب علم ہیں اور تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو ہر آواز پر لبیک کہتے ہیں۔ وہ ہوا میں اڑنے والے ان مچھروں جیسے ہیں، جو ہوا کے رخ پر اپنے ارادے اور اختیار کے بغیر، اڑتے رہتے ہیں۔"[1]

اس قسم کے لوگ اپنی صلاحیت کے غنچوں کو کھلانے کی کوشش کرنے اور ان کی خوشبو ہر جگہ بکھیرنے کی بجائے اپنی فکر کی غنچے پر سرپوش ڈھک دیتے ہیں اور اسے مرجھانے دیتے ہیں۔

یہ لوگ ہر طرف اس فکر میں آنکھیں گھماتے رہتے ہیں کہ انھیں اڑنے کے لیے دوسروں کے پَر مل جائیں۔

یہ لوگ اس حقیقت سے غافل ہیں کہ مخلوقات کی اس دنیا میں کوئی دو شخص بھی ہر اعتبار سے مساوی نہیں پیدا کیے گئے ہیں۔ کوئی فرد بھی دوسروں کے یکساں اور برابر نہیں ہوتا۔ خواہ وہ چہروں کی بات ہو یا جذبات و احساسات کی۔ کسی شخص کے ہاتھ کی لکیریں تک دوسروں کے جیسی نہیں ہوتیں۔

جب ایسا ہے تو یہ نامعقول بات ہے کہ ہم خود کو دوسروں کی سوچ کا پابند بنالیں اور اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں کے خزانوں سے فائدہ نہ اٹھائیں۔

---

[1] نہج البلاغہ۔ باب حکم و نصائح۔ نصیحت نمبر ۱۴۷

بڑے لوگ ہمیشہ نئی راہ پر چلے ہیں۔ ایسے راستوں پر چلے ہیں جن پر کسی نے قدم تک نہ رکھا تھا۔ انھوں نے انسانوں کے اس معاشرے کو نئے تحفے پیش کیے ہیں۔ ایسے عظیم لوگ زندگی بھر جدید افکار، علوم اور صنعتوں کے موجد رہے ہیں۔

"ڈیکارٹ" کی علمی میدان میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ ایک دن اُس نے تمام علوم خصوصاً فلسفہ میں اپنی تمام معلومات اور اپنے تمام نظریات کو ذہن سے جھٹک دیا۔

یعنی اس نے تمام یقینی مسائل کو بھی مشکوک گردانا۔ اس نے ہر چیز میں شک کیا۔ حتیٰ اس نے یہ بھی شک کیا کہ:

"وہ خود بھی موجود ہے یا نہیں ——— ؟"

اس بنیاد پر وہ تمام علمی اور فلسفہ کے شعبوں میں ایک تبدیلی پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اگر وہ بھی دوسروں کی طرح عالمانہ (Scholastic) فلسفہ کی پیروی کرتا تو یہ کامیابی ہرگز اسے نصیب نہ ہوتی۔ [1]

عظیم لوگ آزادانہ غور کرتے ہیں۔ دوسروں کی سوچ کی قید سے رہائی کو اپنی کامیابی کی سنہری چابی خیال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"خواہ ذاتی معاملے ہوں یا معاشرتی، ان میں اندھی تقلید خودکشی ہے۔"

---

[1] دائرۃ المعارف۔ فرید وجدی جلد ۱۔ مادہ۔ الہ

ایک انوکھی داستان

ماضی میں ایران کے گرم حماموں میں بگل اور ہارن ہوتے تھے۔ حمام والے لوگوں کو یہ بتانے کے لیے کہ گرم حمام کھل گیا ہے، صبح ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے بگل بجایا کرتے تھے۔

اتفاق سے ایک دن ایک شہر میں حمام کا بگل گم ہو گیا یا ناکارہ ہو گیا گرم حمام والے نے بہت کوشش کر کے، بہت زیادہ قیمت دے کر ایک بگل خریدا اور اپنا کام انجام دیا۔

ایک غریب آدمی اس شہر میں نیا نیا آیا تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ یہاں ایک ریال کی چیز دس ریال میں بیچی جا سکتی ہے تو وہ خوش ہو گیا۔ اس نے فوراً فیصلہ کیا کہ بہت زیادہ بگل خرید کر یہاں لائے گا تاکہ ایک کے بدلے دس کمائے۔ اس نے اپنی تجارت کا مال اس شہر کے بڑے چوک پر سجا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ لوگ بگل خریدنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کریں گے۔ اس نے بہت انتظار کیا لیکن کسی نے اسے نہیں پوچھا۔

اتفاق سے ایک دولت مند تاجر عصا ہاتھ میں لیے وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے اس غریب آدمی سے اتنے بہت سے بگل اور ہارن لانے کی وجہ پوچھی۔ اس نے اپنے خیال سے اسے آگاہ کیا۔ چالاک تاجر اس کی حماقت دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا۔ اس نے کہا کہ:

"تم نے آخر یہ نہیں دیکھا کہ پورے شہر میں دو سے زیادہ حمام نہیں ہیں، اتنے سارے

بگل یہاں کس کام آئیں گے؟ بہرحال میں کل
تمھاری خاطر ایک ایسا کام کروں گا کہ ایک ہفتے
کے اندر اندر یہ سب بک جائیں گے۔"

اس آدمی نے پوچھا کہ:

"آپ کیا کام کر سکتے ہیں ——— ؟"

اس تاجر نے جواب دیا کہ:

"اس بات کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بس
اتنا جان لو کہ یہاں کے لوگ اندھی تقلید کرتے
ہیں اور غور و فکر نہیں کرتے۔ میں ان کی اس
کمزوری سے تمھاری خاطر فائدہ اٹھاؤں گا۔"

اس نے اسی وقت ایک بگل امانت کے طور پر لیا اور اپنے نوکر کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اسے گھر میں لے جا کر رکھ دے۔

اگلے دن صبح کے وقت شہر میں یہ معروف اور دولتمند تاجر تجارت کی خاطر نکلا۔ اب اس کے ہاتھ میں عصا کی بجائے بگل تھا۔ جسے زمین پر ٹکا ٹکا کر وہ چل رہا تھا۔ تاجر کی اس حرکت نے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کیا۔

لوگ بڑبڑانے لگے کہ یقیناً زندگی اور تجارت میں اس شخص کی کامیابی کا راز اس کے اسی قسم کے کام ہیں۔ مثلاً اس نے عصا کی جگہ بگل کا سہارا لیا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس خیال کی تائید بھی کر دی۔

"اندھی تقلید کرنے والوں" کے شہر میں ایک شور سا بپا ہو گیا۔ لوگوں نے اپنے اپنے کاموں کو خیرباد کہا اور بگل خریدنے میں مشغول ہو گئے

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ تمام بگل بک گئے۔ بوڑھا تاجر اپنی حرکت کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے اس غریب آدمی سے پھر ملا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ تمام بگل فروخت ہو گئے ہیں تو اس نے اس سے کہا کہ وہ جلد از جلد اس شہر سے نکل جائے۔ کیونکہ کل حالات مختلف ہوں گے۔

اس کے اگلے دن جھکی ہوئی کمر والا یہ تاجر بگل کی بجائے پھر سے عصا کا سہارا لیے ہوئے نمودار ہوا۔ لوگ اپنے کیے پر پچھتانے لگے۔ لوگ سمجھ گئے کہ وہ اندھی تقلید کے چکر میں آ گئے ہیں۔ نہ عصا کامیابی کی علامت تھا اور نہ بگل۔

مولانا رومی کے بقول ہے

"مر مرا تقلید شان برباد داد
ای دو صد لعنت بر این تقلید باد
(مجھے ان کی تقلید نے برباد کر دیا۔ ایسی تقلید پر
ہزار لعنت ہو)

جس طرح ایک فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی راہ خود بنائے اور اپنی شخصیت کے جوہر کو جلا بخشے۔ اسی طرح ایک کامیاب معاشرے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں نئی راہوں پر آگے بڑھنے کی خاصیت ہو اور وہ اندھی تقلید نہ کرے۔ جب تک ایسا نہ ہو معاشرہ ترقی یافتہ نہیں ہو سکتا۔

ہمارے معاشرے کے بعض غلط سوچ رکھنے والے جوان، دھوکا دینے والے پروپیگنڈوں سے متاثر ہو کر یہ تصور کرتے ہیں کہ صنعت کے میدان میں مغرب کی ترقی کا راز مذہب اور اخلاق سے دوری ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ

مشرق پر مغرب کی برتری کی وجہ رقص و سرود کی محفلیں اور ان کی عورتوں کی برہنگی ہے۔ ایسے لوگوں میں سے بعض احساسِ کمتری کی وجہ سے ان کے جیسے بن جانا چاہتے ہیں۔ انھیں کے جیسا لباس اور ہیٹ پہنتے ہیں۔ انھیں کی جیسی مغربی وضع قطع اختیار کر لیتے ہیں مگر ایسے لوگ اس بات سے غافل رہتے ہیں کہ یہ ایک صنعتی قوم کی وضع قطع ہے۔

ان کی برتری کی بنیاد علم و دانش اور ان کی اعلیٰ تحقیقات ہیں۔ اور ان کے تمدن کی بنیاد یہ ہے کہ وہ کسی سپر طاقت کے غلام نہیں ہیں۔ وہ ایک مستقل قوم کی طرح اپنے پیروں پر کھڑے ہیں اور سائنسی تحقیقات میں مشغول ہیں۔

یہاں مناسب ہے کہ ہم پاکستان کے عظیم دانشور محمد اقبالؔ کے بلند افکار پر غور کریں اور ان کی گرانقدر خدمات کے شکریے میں ان کے اشعار نقل کریں ؎

شرق را از خود برد تقلید غرب
باید این اقوام را تنقید غرب
قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نی ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نی ز سحرِ دخترانِ لالہ رُو
نی ز عریاں ساق و نی از قطع مُو
محکمی او را نہ از "لادینی" است
نی فروغش از خطِ "لاتینی" است
قوت از طرزِ کلاہ و جامہ نیست
مانع از علم و ادب عمامہ نیست

قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمین آتش چراغش روشن است
علم و فن را ای جوانِ شوخ و شنگ
علم میباید نہ ملبوسِ فرنگ
اندر این رہ جز نگہ مطلوب نیست
این کلہ یا آن کلہ مطلوب نیست
فکر چالاکی اگر داری بس است
طبع ادراکی اگر داری بس است

(مغرب کی تقلید، مشرق کو اس بات میں مبتلا کر دیتی ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو بھول جائیں حالانکہ ان (مشرقی) قوموں کو تو مغرب پر تنقید کرنی چاہیئے۔ مغرب کی قوت نہ تو گانے باجے سے ہے اور نہ برہنہ لڑکیوں کے رقص سے۔ مغرب کی قوت نہ تو سرخ و سفید لڑکیوں کے حسن کے جادو سے ہے، نہ عریاں پنڈلیوں سے ہے۔ اور نہ کٹے ہوئے بالوں سے ہے۔ مغرب کا استحکام "بے دینی" سے بھی نہیں ہے اور نہ اس کی ترقی "لاطینی" رسم الخط کے باعث ہے۔ قوت کا تعلق ٹوپی اور لباس کی ساخت سے نہیں ہے۔ عمامہ، علم و ادب کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے۔ فرنگیوں کی قوت علم و فن سے ہے۔ یہ چراغ اسی آگ سے جل رہا ہے۔ اے شوخ اور اٹھڑ جوان! تجھے علم پر توجہ دینی چاہیئے۔ فرنگیوں کے لباس پر نہیں۔ اس راہ میں علمی نظر

کے علاوہ اور کچھ درکار نہیں ہے۔ اس راہ میں ایسی ٹوپی یا ویسی ٹوپی نہیں دیکھی جاتی۔ اگر تم کو ذہین اور قابل بننے کی فکر ہے تو یہی بس ہے۔ اگر تمھاری طبیعت کچھ (علم) حاصل کرنے پر مائل ہے تو یہی کافی ہے۔"

مغرب زدہ قومیں اپنے ذہنوں کو جھنجھوڑنے، بڑی ظالم طاقتوں کے ہاتھوں کو توڑنے اور زندگی کی راہ کو علم و فکر کے چراغ سے روشن کرنے کی بجائے مغربی لباس اور ہیٹ میں پناہ لیتی ہیں۔

کسی بھی قوم کے پاس جب تک اس کا اپنا مستقل تعلیمی اور اقتصادی نظام نہ ہو، اس وقت تک وہ زندگی میں کوئی نمایاں کام انجام نہیں دے سکتی۔

ہمارے پاس ۱۲۶۸ھ قمری سے "دارالفنون" نامی ایک علمی اور تحقیقاتی ادارہ موجود ہے۔ اس ادارے کے کام کا آغاز ایک بلند ہمت و ذہین اور عظیم ایرانی شخص مرحوم میرزا تقی خان امیر کبیر نے کیا تھا۔

سُپر طاقت نے احساس کیا کہ ایرانی قوم ایک نئی راہ پر گامزن ہو گئی ہے اور مزید ایسے راستوں پر چلنا چاہتی ہے جن پر ابھی تک کوئی نہیں چلا۔ پھر زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ "ظلم" اور استعمار کے نوکروں نے انھیں کاشان شہر کے ایک حمام میں قتل کر دیا۔ اس کے بعد سے آج تک سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن ہمارے تعلیمی اداروں میں سائنس اور دیگر علوم پر انتہائی معمولی تحقیق بھی نہیں ہو پائی ہے۔

موجودہ دَور کے زبردست شاعر "شہریار" نے تعلیمی نصاب کے بارے میں اپنے دل کی آواز اشعار کے سانچے میں ڈھال کر کچھ اس طرح کہا ہے ؎

فرہنگ ما برای جہالت فزودن است
مامور زشت بودن، و زیبا نمودن است

یک درس زندگی بجوانان نمیدھد
طوطی مثال، قصۂ مہمل سرودن است

در لبستہ باد، مدرسہ ای را کہ قصد آن
بر روی ملتی در ذلت گشودن است

بیدار شو کہ نغمۂ طنبور اجنبی
لالائی است، از پی سنگین غنودن است

دارالفنون کہ سرگل عمرت دھد بباد
شش سال تازہ از پی ذوق آزمودن است

(ہمارا تعلیمی نصاب جہالت میں اضافہ کے لیے ہے۔ اس لیے ہے کہ ہم بُرے رہیں لیکن خود کو اچھا سمجھتے رہیں۔ یہ جوانوں کو زندگی کا ایک درس بھی نہیں دیتا۔ اس میں طوطے کی طرح بے فائدہ قصہ رٹ لینا ہوتا ہے۔ ایسے اسکول کا دروازہ بند ہو جانا چاہیے جس کا مقصد ایک قوم کے سامنے ذلّت کا دروازہ کھولنا ہو۔ بیدار ہو جاؤ کہ اجنبی کی سارنگی کا نغمہ گہری نیند سلا دینے کے لیے ایک لوری ہے ایسا تعلیمی ادارہ جو تمھاری عمر کے ابتدائی حصے کو برباد کر دے اس میں داخل ہونے کا نقصان یہ ہے کہ از سر نو علم حاصل کرنا ہو گا اور علم حاصل کرنے کا ذوق پیدا کرنے کے لیے مزید چھ سال درکار ہوں گے۔)[1]

---

[1] دیوانِ شہریار۔ صفحہ ۲۵۵

اگر آج ہماری یونیورسٹی کا وائس چانسلر یہ بات کہے تو بے جا نہیں ہے کہ :

" ہمارے انٹر پاس طلبہ فارسی نہیں جانتے، اور
جب وہ فارسی نہیں جانتے تو یقیناً وہ کچھ
بھی نہیں جانتے ۔"

(روزنامہ اطلاعات شمارہ ۹۷۰۳) [1]

پیروی کرنے والی قوم جو استقلال کے ساتھ غور و فکر کرنے سے بیزار ہو اور ہمیشہ دوسروں کی فکر پر تکیہ کرتی ہو وہ بھیڑوں کے ایک گلہ کی طرح ہے ہے۔ پہلی بھیڑ جو کرے دیگر تمام بھیڑیں بھی وہی کرتی ہیں۔ اگر ایک بھیڑ کے سامنے لکڑی کی رکاوٹ کھڑی کر دیں تاکہ وہ اس کے اوپر سے پھلانگ کر آگے بڑھے تو تمام بھیڑیں اس کی دیکھا دیکھی اسی طرح چھلانگ لگائیں گی۔ حتیٰ کہ اگر آپ لکڑی ہٹا بھی دیں تو بھی اس جگہ پہنچ کر باقی بھیڑیں ضرور چھلانگ لگائیں گی۔

کہتے ہیں کہ " فجی " نامی علاقہ کا سردار ایک کوہستانی راستے کو عبور کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے لوگوں کا ایک دستہ بھی تھا۔ اتفاق سے ان کا سردار زمین پر گر گیا۔ یہ دیکھ کر فوراً تمام لوگوں نے خود کو زمین پر گرا دیا۔ صرف ایک شخص کھڑا رہا۔ اس نے اس غلط پیروی پر باقی لوگوں کی مذمت کی۔
آپ کو تعجب ہوگا کہ باقی تمام لوگوں نے الٹا اسی پر تنقید کی اور یہ کہا کہ:

" کیا تم سردار سے زیادہ اور بہتر سمجھ بوجھ
رکھتے ہو ——— ؟! "

---

[1] آیا آج ہمارے ملک کے تعلیمی اداروں کا بھی یہی حال نہیں ہے ؟ (مترجم)

ہماری عظیم آسمانی کتاب قرآن مجید میں اندھی تقلید اور دوسروں کی فکر پر تکیہ کرنے کی بے انتہا مذمت کی گئی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ایک مدت تک توحید کی پرچم بردار اور بت پرستی کے خلاف جہاد کرنے والی تھی۔ لیکن غلط پیروی کے زیر اثر وہ سینکڑوں سال تک لکڑی اور دھات کے بتوں کی پرستش میں مبتلا رہی۔ اس نے خانۂ توحید یعنی کعبہ کو لات و عزیٰ نامی بتوں کا گھر بنا دیا۔

ہوا یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے ایک شخص اپنی سرداری کے زمانے میں حجاز سے باہر سفر پر گیا۔ دوران سفر بُت پرست اقوام کی حالت نے اسے متاثر کیا۔ اس نے فوراً ایک بُت اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اس طرح ایک توحید پرست قوم اس کی اندھی تقلید کے اثر میں مشرک ہوگئی۔

البتہ اندھی تقلید سے ہماری مراد غلط قسم کی نقصان دہ پیروی ہے ورنہ اگر تقلید کے یہ معنی ہوں کہ نادان، دانا سے اور اناڑی، ماہر سے رجوع کرے تو یہ تقلید مذموم اور بُری نہیں ہے۔ بلکہ ایسی تقلید تو ترقی یافتہ معاشروں میں زندگی کی اساس شمار کی جاتی ہے۔ بیمار، ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے۔ کام کروانے والا کاریگر سے رجوع کرتا ہے اور ان کی باتوں کو بے چون و چرا مان لیتا ہے۔

غلط پیروی کرنیوالے ایک صوفی کا قصہ

ایک خانقاہ میں دسیوں تہی دست درویش زندگی گزار رہے تھے۔ اتفاق سے ایک اور درویش سفر سے واپس لوٹا اور اپنے گدھے کو خانقاہ کے رکھوالے کے حوالے کیا اور خود خانقاہ میں آگیا تاکہ ایک رات

درویشوں کی بزم میں شرکت کرے۔

بھوکے درویشوں نے اس کی آمد کو غنیمت جانا۔ خلوت میں میٹنگ ہوئی۔ انھوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا کہ:

"اس خانقاہ کے درویش بھوک سے نڈھال ہو رہے ہیں۔ ایسی حالت میں تو اسلام نے بھوکوں کے لیے "مردار" کا گوشت کھانا بھی جائز قرار دیا ہے۔ پس اس نئے درویش کے گدھے کو بیچ دینا مباح اور جائز ہوگا۔"

یہ بات سب نے قبول کی اور مسافر درویش کو بتائے بغیر اس کا گدھا بیچ دیا گیا۔ پھر اس کے پیسے سے سب درویشوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد قوالی اور ایک ساتھ ناچنے کی محفل بپا ہوئی۔ مسافر درویش بھی ان میں شامل ہو گیا۔

گانے والے گویّے نے "گدھا گیا —" کے جملے سے محفل کا آغاز کیا۔

چون سماع آمد ز اوّل تا کران
مطرب آغازید یک ضرب گران
خر برفت و خر برفت، آغاز کرد
زین حرارت جمله را انباز کرد
زین حرارت پا یکوبان تا سحر
کف زنان، خر رفت، خر رفت اے پسر

از رہ تقلید آن صوفی ہمین
خر برفت آغاز کرد ، اندر چنین

(جب رات بھر کے لیے محفل سماع منعقد ہوئی تو گویّے نے ایک ڈھول پر زوردار ضرب لگائی اور "گدھا گیا گدھا گیا" کہنا شروع کیا۔ اس جملے کو اتنی گرم جوشی سے سب نے مل کر ناچتے ہوئے اور تالیاں بجاتے ہوئے پڑھا کہ ان کی دیکھا دیکھی مسافر صوفی نے بھی "گدھا گیا" کہنا شروع کیا۔)

"گدھا گیا" "گدھا گیا" کا ورد طلوع فجر تک ہوتا رہا۔ گدھے کا اصل مالک بھی بے خبری میں اسی "ورد" کو ان کے ساتھ بہت ذوق و شوق سے دہراتا رہا۔

صبح کو درویشوں نے خانقاہ خالی کر دی۔ سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ گدھے والا درویش باہر آیا۔ اس نے خانقاہ کے رکھوالے سے اپنا گدھا طلب کیا۔ اس نے جواب دیا کہ:

"بھوکے صوفیوں نے کل رات تمھارا گدھا بیچ کر اپنے لیے کھانے کا بندوبست کیا اور تم خود بھی اس ضیافت کی رسموں میں شامل تھے۔"

پھر اس نے کہا ہے

گفت من مغلوب بودم صوفیان
حملہ آوردند و بودم بیم جان

تو جگر بندی میان گرگان
اندر انداری و جوئی زان نشان

درمیانِ صد گرسنہ گربہ ای
پیش صد سگ گربۂ پژمردہ ای

(میں مغلوب تھا۔ صوفیوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا اور میں نیم جان ہو گیا تھا۔ تم بھیڑیوں کے درمیان گھر گئے تھے اور اب تم ان کا پتہ پوچھتے ہو۔ تم تو سو بھوکوں کے درمیان ایک بلی تھے یا پھر سو کتوں کے سامنے ایک ادھ موئی بلی۔)

بے چارے درویش نے کہا:

"مجھے تم نے اس حرکت سے آگاہ کیوں نہیں کیا، اب میں کس کا گریبان پکڑوں؟! کس کو قاضی کے پاس لے کر جاؤں؟!"

رکھوالے نے کہا:

"خدا کی قسم! میں تمھیں بتانے کے لیے آنا چاہتا تھا لیکن جب خانقاہ کے اندر آیا تو دیکھا کہ تم بھی ان کی طرح بلکہ ان سے زیادہ شوق کے ساتھ "گدھا گیا، گدھا گیا...." دہرا رہے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ تم یقیناً گدھے والے معاملے سے آگاہ ہو۔ ورنہ ایک درویش کے لیے بے سوچے سمجھے کسی جملے کو دہرانا نامعقول ہوگا۔ ؎

گفت واللہ آمدم من بارہا
تا ترا واقف کنم زین کارہا

تو ہمی گفتی کہ خر رفت اے پسر
از ہمہ گویندگان با ذوق تر

باز میگفتم کہ او خود واقف است
زین قضا راضی است مرد عارف است

(اس نے کہا کہ اللہ کی قسم میں تمہیں ان کاموں سے واقف کرنے بار بار آیا۔ لیکن تم بھی دوسروں کی نسبت زیادہ ذوق وشوق سے گدھا گیا، گدھا گیا کہہ رہے تھے میں نے سوچا کہ یقیناً تم حالات سے واقف اور راضی ہو ملنگ آدمی ہو)

بے چارے درویش نے کہا:

"میں نے دیکھا کہ دوسرے لوگ یہ جملہ کہہ رہے ہیں تو مجھے بھی اچھا لگا اور میں نے بھی کہنا شروع کر دیا۔ اب جس پریشانی میں میں مبتلا ہوں یہ اسی اندھی تقلید کا نتیجہ ہے ؎

گفت آنرا جملہ می گفتند خوش
مر، مرا ہم ذوق آمد گفتنش

مر، مرا تقلید شان برباد داد
کہ دو صد لعنت بر این تقلید باد

خاصہ تقلید چنیں بے حاصلان
کآبرو را ریختند از بہر نان

(اس نے کہا کہ وہ لوگ اچھے انداز سے ایک جملہ کہہ رہے تھے تو مجھے بھی ان کا ساتھ دینے کا شوق ہوا۔ مجھے ان کی تقلید نے برباد کر دیا۔ ایسی تقلید پر ہزار لعنت ہو ایسے ناکارہ لوگوں کی تقلید کا کیا حاصل جنھوں نے روٹی کی خاطر اپنی عزت مٹی میں ملا دی۔)

آجکل مغرب زدہ قومیں، مغربی صنعتوں کی شان و شوکت پر فریفتہ ہیں۔ اور اپنے تشخص کو اس طرح کھو بیٹھی ہیں کہ گویا وہ خود کسی تہذیب اور اپنے علوم و فنون کی وارث نہیں ہیں۔

لوگ مغرب کے بے فائدہ طریقوں کو اپناتے ہیں اور وہ بھی لباس اور رسم و رواج میں۔ گویا ان کی تمام شخصیت اسی سے وابستہ ہے۔

اس سلسلہ میں مولوی میر ہادی کہتے ہیں :

علم و عقل و دانش و دین، در درون جامہ نیست
در کلاہ مولوی و فینہ و عمامہ نیست

درحقیقت آدم از علم و عمل علامہ است
ورنہ شخص از رخت کوتاہ و بلند علامہ نیست

(علم و عقل، دانش اور دین، لباس، مولوی کی ٹوپی، مصری سرخ ٹوپی یا عمامہ سے وابستہ نہیں۔ درحقیقت آدمی علم و عمل کی وجہ سے علامہ بنتا ہے۔ اور کوئی بھی شخص اونچا پاجامہ پہننے سے علامہ نہیں بن جاتا۔)

مشاورت

مثبت اور منفی دو تاروں کے ملنے سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح دو فکروں کے ملنے سے فروغ پیدا ہوتا ہے۔ کبھی تو مشاورت انسان کے آگے کی راہ کو روشن کر دیتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس طرح ایک وسیع افق منور ہو جاتا ہے۔

البتہ مشورہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان خود کو مکمل طور پر دوسروں کے حوالے کر دے۔ کیونکہ اس کا نتیجہ وہی غلط پیروی اور اندھی تقلید کی صورت میں نمودار ہوگا۔ جو کہ ایک قسم کی خودکشی ہے۔ یعنی اس کا مطلب اپنی عقل اور اپنے پاک احساسات کو قتل کر دینا ہے۔

مشورہ کا مطلب یہ ہے کہ انسان مشکلات کے حل کا طریقہ دوسروں سے دریافت کرے اور ان کی ہدایتوں پر کافی غور و خوض کے بعد عمل کرے۔

جنگِ خندق میں عرب مشرکوں کی ٹڈی دل کی طرح کی فوج نے

"مدینہ" فتح کرنے کے لیے اس شہر کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ پیغمبر اکرمؐ نے فوجی ماہروں کی ایک میٹنگ تشکیل دی۔ ایک تجربہ کار ایرانی صحابی "سلمان فارسی" نے تجویز پیش کی کہ شہر کے مخدوش علاقوں میں تین میٹر چوڑی اور دو میٹر گہری ایک خندق کھودی جائے اور خندق کے اندر ہر سو قدم کے فاصلے پر نگرانی کے لیے ایک ایک مورچہ بنایا جائے اور طاقتور جانبازوں سے کہا جائے کہ وہ خندق کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھالیں اور دشمن کی فوج کو نزدیک آنے سے روکیں اور بڑھنے والے دشمن پر پتھروں اور تیروں کی بوچھاڑ کر کے اسے پیچھے دھکیل دیں۔

حضرت سلمان فارسی کی رائے پیغمبر اکرمؐ اور دیگر افراد کو پسند آئی اور پچیس روز کی کوشش کے بعد خندق کھودنے کا کام مکمل ہوا۔ دشمن کے سپاہی اس فوجی ٹیکنک کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ ایک مہینے تک اسی طرح پڑاؤ ڈالنے کے بعد چند آدمیوں کے قتل کا نقصان برداشت کر کے واپس چلے گئے۔ [1]

ترقی یافتہ دنیا میں حکومتوں کی بنیاد ہی مجلس شوریٰ اور سینیٹ پر ہوتی ہے۔ انتہائی بدبخت اور ذلیل ترین قوم وہ ہوتی ہے جو کسی بڑی ظالم طاقت کے زیر اثر رہے اور قوم کی قسمت کو ایک فرد کے ہاتھ میں دے دے۔

مشورہ لینا اسلام کی اعلیٰ تعلیمات میں سے ایک ہے۔ خداوند تعالیٰ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ:

"شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ"

"(اے محمدؐ) معاشرتی اور سیاسی امور میں اپنے دوستوں سے مشورہ لو۔" [2]

---

[1] تاریخ کامل ابن اثیر۔ جلد۔ ۲۔ صفحہ ۱۲۲۔۱۲۳

[2] آلِ عمران: ۱۵۹

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "بدر" کے جلتے ہوئے میدان میں تھے۔ دشمن کئی گنا زیادہ تعداد میں تھا۔ اس کا اسلحہ بھی جدید اور مہلک تھا۔ دشمن، اسلام کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا تھا۔

آپؐ نے فوجی ماہرین کی ایک زبردست میٹنگ تشکیل دی۔ لوگوں کی طرف منہ کیا اور فرمایا:

"اَشِیْرُوا اِلَیَّ اَیُّھَا النَّاسُ۔"

اس بیابان میں قریش سے جنگ کرنے کے سلسلے میں اپنی رائے سے مجھے آگاہ کرو۔ آیا مصلحت یہی ہے کہ ہم آگے بڑھیں اور دشمن کا مقابلہ کریں یا پھر اسی جگہ سے "مدینہ" واپس چلے جائیں۔؟!

"مقداد" نام کے ایک صحابی کھڑے ہوتے اور کہنے لگے:

"ہمارے دل آپؐ کے ساتھ ہیں۔ ہم آپؐ سے وہ بات نہیں کہیں گے جو بنی اسرائیل نے موسیٰؑ سے کہی تھی۔ جب انھوں نے بنی اسرائیل کو جہاد کی دعوت دی تو بنی اسرائیل نے یہ جواب دیا تھا کہ اے موسیٰ! آپ اور آپ کا خدا جنگ کے لیے چلے جائیں ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ اے محمدؐ! آپؐ اور آپؐ کا خدا جہاد کے لیے جائیں اور ہم بھی آپؐ کے ہمراہ ہیں۔"

انصاری صحابیوں میں سے ایک اور صحابی "سعد ابن معاذ" کھڑے ہوئے اور بحیرۂ احمر کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ:

"اے رہبرِ اعظمؐ! اگر آپؐ اس سمندر میں جانے لگیں
تو ہم بھی آپؐ کے پیچھے پیچھے سمندر میں کود پڑیں گے
ہم میں سے کوئی بھی آپؐ کی پیروی سے منہ نہیں موڑے گا
ہم دشمن کا سامنا کرنے سے ہرگز نہیں ڈرتے۔ شاید
اس راہ میں ہم کچھ ایسی خدمات انجام دیں جو آپؐ کو
خوش کر دیں۔"

ان دو صحابیوں کی باتیں دیگر صحابہ نے بھی پسند کیں، لشکرِ اسلام میں ایک عجیب ولولہ سا پیدا ہو گیا۔ اس طرح پیغمبرِ اکرمؐ نے پیش روی کا ارادہ کیا۔ اس مشورہ کے ذریعے آپؐ نے اپنے لشکر میں ایک جذبہ پیدا کیا۔ اور فوراً حرکت کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ [1]

آپؐ نے صرف یہی نہیں بلکہ دیگر موقعوں پر بھی مثلاً جنگِ احد اور جنگِ خیبر میں بھی مشورے لیے اور اچھے نتائج حاصل کیے۔

کم عمر افراد کو چاہیے کہ وہ تجربہ کار لوگوں کے تجربوں سے فائدہ اٹھائیں کیونکہ وہ زمانے کے سرد و گرم کا مزا چکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے تجربہ کی کمی کی وجہ سے ہم کام کی ظاہری حیثیت کو دیکھیں اور کام کے نتائج سے بے خبر رہ جائیں۔

خلیفۂ دوم کے دورِ حکومت میں جو بڑی بڑی فتوحات مسلمانوں کو نصیب ہوئیں ان کی وجہ "مشورہ" ہی تھی۔

خلیفۂ وقت اپنی مشکلات کو امیر المومنین علی علیہ السلام کے سامنے پیش کرتے تھے۔ وہ اپنی مخصوص نظر کے تحت جنگوں میں کامیابی کے رموز خلیفہ

---

[1] ابن ہشام۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۵۳

کو بتاتے تھے۔

جب خلیفہ نے "ساسان" کی حکومت سے جنگ کے بارے میں علی علیہ السلام سے مشورہ لیا اور کہا کہ :

" اگر آپؑ کا مشورہ ہو تو میں خود اس جنگ میں شرکت کروں ؟"

امیرالمومنینؑ نے جواب میں کہا :

" اگر مسلمان اس جنگ میں شکست کھا جائیں تو ایسی صورت میں ان کے لیے کوئی پناہ گاہ نہیں رہے گی لیکن اگر آپ حکومتِ اسلامی کے دارالحکومت میں رہیں اور وہ شکست سے روبرو ہو جائیں تو ایسی صورت میں آپ ان کے لیے کمک بھیج سکتے ہیں اور وہ لوگ ایک پناہ گاہ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔" [1]

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۳۰

تاریخ بہترین اُستاد ہے

ہماری ایک خوش قسمتی یہ بھی ہے کہ ہم دنیا میں آنے والے پہلے فرد نہیں ہیں۔ اس آسمان نے زمین پر لاکھوں آدمیوں کی زندگی ستاروں کی بیدار آنکھوں سے دیکھی ہے۔ ان آدمیوں کو خوشیاں بھی ملیں، غم بھی ملے، روشنیاں بھی ملیں، تاریکیاں بھی نصیب ہوئیں، عشق میں بھی مبتلا ہوئے اور نفرت بھی کی۔ جنگیں بھی کیں اور صلحیں بھی کیں۔ غرض ان لوگوں نے زندگی کے ہزاروں رُخ دیکھے۔

اگرچہ ہم سے پہلے کے بہت سے لوگ اپنی زندگی کے راز ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے کر خاک میں دفن ہو گئے۔ اور بھلا دیے گئے۔ لیکن پھر بھی لکھنے والوں نے، زمین کے مختلف طبقوں نے اور بظاہر خاموش ویرانوں اور کھنڈرات نے ان کی زندگی کے قابل توجہ حصے ہمارے لیے محفوظ کر رکھے ہیں اور دنیا کو ہمارے لیے ایک عظیم اور گرانقدر درس گاہ بنا دیا ہے۔

قدیم لوگوں کی تاریخ کے صفحات کے مطالعہ، زمین کے مختلف طبقوں کے بارے میں تحقیق اور پرشکوہ لیکن عبرت انگیز آثار قدیمہ پر غور سے ہمیں کئی سبق حاصل ہوتے ہیں اور اس طرح ہم اپنے سے بڑی عمر والوں کی طرح زیادہ سمجھدار ہو جاتے ہیں۔

کیا ایسا نہیں ہے کہ پوری زندگی کا حاصل تھوڑا بہت "تجربہ" ہی ہوتا ہے ——— ؟!

کیا تاریخ بہترین تجربات سے ہمیں آشنا نہیں کرتی ہے ؟!

کیا تاریخ گزشتہ قوموں کو مکمل طور پر دکھانے والا ایک آئینہ نہیں ہے ——— ؟!

اُس میں قوموں کی بدبختی اور ان کے بُرے انجام
اور ان کی کامیابی اور کامرانی کے اسباب کا عکس دکھائی دیتا ہے ——— !

آسمانی کتاب قرآن مجید میں یہ حکم موجود ہے کہ ہم گزشتہ اقوام کی زندگی کا مطالعہ کریں اور ان کی زندگی کی خصوصیات سے درس عبرت لیں۔ [1]

امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"میرے بیٹے! اگرچہ میں گزشتہ قوموں کا ہم عصر نہیں تھا لیکن میں نے ان کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا ہے۔ اس طرح میں زمانے کی اونچ نیچ اور قوموں کے قوانین سے واقف ہوا ہوں۔ میں

---

[1] سورۂ روم۔ آیت ۹

ان کی تاریخ پر اس طرح مسلط ہوں کہ گویا میں
نے ان کے ساتھ زندگی گزاری ہو۔"

تاریخ موجودہ نسل کی بہترین رہنما ہے۔ تاریخ پڑھانا۔ فزکس اور کیمسٹری پڑھانے سے کئی گنا زیادہ مشکل ہے۔ فزکس اور کیمسٹری میں فارمولے ہوتے ہیں۔ اگر استاد فارمولوں پر دسترس رکھتا ہو تو وہ اچھی طرح پڑھا سکتا ہے۔ لیکن تاریخ کے لیے غور، تحقیق، کوشش اور صحیح نتیجے تک پہنچنا لازم ہے۔ تاریخ کے اساتذہ جب تک اس کی صلاحیت کو خود میں محسوس نہ کریں اس وقت تک وہ تاریخ پڑھانے کا حق ادا نہیں کر سکتے اور تاریخ سے اعلیٰ نتائج حاصل نہیں کر سکتے۔
اسی بنا پر ہر تاریخ دان شخص کو مؤرخ نہیں کہا جا سکتا ہے

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجا است
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند
(بال سے زیادہ باریک نکتہ یہ ہے کہ ہم ہر اس شخص کو
قلندر نہ سمجھیں جو بال نہ کٹاتا ہو)

ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ تاریخ کے رموز اور حقائق کو سمجھیں۔ ورنہ صرف تاریخ پڑھ لینے یا رٹ لینے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تاریخ کے رموز و حقائق وہ کڑوی دوائیں ہیں جنھیں انسان بہت مشکل سے حاصل کرتا ہے، انسان ان دواؤں سے انفرادی اور معاشرتی بیماریوں کا علاج کر سکتا ہے۔
ہر سمجھدار شخص بالخصوص حکومت کا یا کوئی اور انتظام چلانے والوں پر لازم ہے کہ وہ انگلستان کی تاریخ، فرانس کے عظیم انقلاب کی تاریخ اور خاص طور پر تاریخ اسلام اور بنی امیہ کی حکومت کے اختتام اور بنی عباس کے انقلاب پر

خوب غور اور تحقیق کریں اور ان لوگوں کی حکومت کے اختتام اور بدبختی کے اسباب معلوم کریں جو سالہا سال سے عوام پر حکومت کرتے چلے آرہے تھے۔

اصولی طور پر ہم کو کوشش کرنی چاہیئے کہ خود میں مطالعہ اور کتب بڑھنے کا شوق پیدا کریں کیونکہ مطالعہ فکر کی سطح کو بلند کرتا ہے۔ دماغ کی صلاحیتوں کو تقویت دیتا ہے اور کسی بڑے انسان کی زندگی کے سرمائے کو مفت انسان کے حوالے کر دیتا ہے۔

آجکل کسی بھی ملک کی ترقی اور اس کے تمدن کا اندازہ اس ملک میں کاغذ کے استعمال کی مقدار سے ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ "سوئٹزرلینڈ" میں (جو کہ تمدن کا گہوارہ کہلاتا ہے) آبادی کے تناسب سے اگر دیکھا جائے تو دنیا کے ہر ملک سے زیادہ کاغذ خرچ ہوتا ہے۔ ماہرین کی تصدیق کے مطابق ایران کے مرکزی صوبے (تہران) میں اتنا ہی کاغذ صرف ہوتا ہے جتنا باقی تمام صوبوں میں ملا کر صرف ہوتا ہے۔

آجکل یہ نوٹ کیا جاتا ہے کہ کسی ملک میں سال بھر میں کتنی کتابیں چھپیں۔ اور ہر طباعت میں ایک کتاب کی کتنی تعداد چھاپی گئی۔

یہ بھی نوٹ کیا جاتا ہے کہ عوام کے لیے کھولی گئی لائبریریوں میں سال بھر میں کتنے لوگ آئے۔

اس طرح یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ پچھلے برسوں کی نسبت اس سال فکر میں کتنی برتری پیدا ہوئی۔ یا دیگر ممالک کی نسبت اس ملک میں فکر و شعور کی کیا کیفیت ہے۔

مؤلفین کے چھپے ہوئے راز کتاب میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتے ہیں ایک دن ارسطو نے اپنی کتاب کو چھپوانا چاہا تو سکندر نے رکاوٹ ڈالی۔ تاکہ

دوسرے لوگ اس کے استاد کے بلند افکار تک نہ پہنچ پائیں۔

درمیانی صدیوں میں پاپ اور پادریوں نے خاص لوگوں کے لیے "علمی انجمن" تشکیل دی تھی۔ اور عوام کے لیے کتاب پڑھنا ممنوع قرار دیا تھا تاکہ وہ عوام کی نادانی اور جہالت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ اور ان پر بہتر طریقے سے مسلط رہ سکیں۔

ایک اچھی کتاب، اخلاق سنوارتی ہے اور شخصیت کی تعمیر کرتی ہے کتاب زندگی کے اسرار و رموز سکھاتی ہے۔ لیکن بے فائدہ کتابیں پڑھنے سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ ایسی کتابیں ذہنی صلاحیت کو کم کر دیتی ہیں۔

ایک دانشور نے کہا ہے کہ:

"مجھے بتاؤ کہ تم کیا پڑھتے ہو تاکہ میں بتا سکوں
کہ تم کیا ہو؟!"

شاپن ہاور کے بقول:

"انسان بے کار کتابیں پڑھنے میں عمر صرف کرے،
عمر اس سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔

ہم کو مسلسل یہ کوشش کرنی چاہیے کہ "چوبیس گھنٹوں" میں کچھ وقت مفید اور کچھ سکھانے والی کتابوں کے مطالعہ کے لیے مخصوص کر دیں اور کتاب کو اپنا بہترین دوست سمجھیں ؎

خوشتر ز کتاب در جہان یاری نیست
در غم کدۂ زمانہ غم خواری نیست

ہر لحظہ از او بگوشۂ تنہائی
صد راحتی است ہرگز آزاری نیست

(کتاب سے بہتر دنیا میں کوئی دوست نہیں ہے۔
کتاب کے علاوہ زمانے کے غم کدہ میں کوئی غم خوار
نہیں ہے۔ تنہائی کے گوشہ میں اس کے ساتھ ہر لمحہ
ہزار راحت ہے اور کوئی زحمت نہیں ہے)

فرصت سے استفادہ

لوگوں کو اچھی خاصی فرصت میسر ہوتی ہے لیکن کیونکہ "آج کا کام کل پر ڈالنے" کا رجحان عام ہے اس لیے لوگ کامیابی کے راز کی سنہری چابی یعنی فرصت کو گنوا بیٹھتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ نہ صرف آج کا کام ہم کل پر نہ ڈالیں بلکہ اگر ہوسکے تو آئندہ کل کا کام بھی آج کرلیں۔

ابو مسلم خراسانی سے پوچھا گیا کہ:

"آپ کی کامیابی کا راز کیا رہا ہے ــــــ؟"

تو انھوں نے جواب دیا:

"میں نے کبھی آج کا کام کل پر نہیں ڈالا ــــ!"

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جتنی طاقت کام کو التوا میں ڈالنے میں صرف ہوتی ہے، اتنی ہی طاقت خود اس کام کو انجام دے دینے کے لیے کافی ہوتی ہے

ایسے طلبا جنھیں ماہ مئی کے امتحان کے لیے قبول نہیں کیا جاتا اور انھیں

ماہ اگست میں امتحان دینا ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض اس فرصت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض اوہام میں، افسوس کرنے میں اور آہیں بھرنے میں وقت کو ضائع کر دیتے ہیں۔

یہاں تک کہ امتحان کا دن آجاتا ہے۔ ایسے لوگ نہ صرف یہ کہ ترقی نہیں کر پاتے بلکہ فرصت گنوانے کی وجہ سے چند قدم مزید پیچھے ہو جاتے ہیں۔

بعض لوگ غالباً درویش قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کا کام صرف ماضی پر آنسو بہانا ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ:

"اگر ہم نے فلاں باغ خریدا ہوتا تو ہمیں بہت فائدہ ہوتا۔ اگر ہم فلاں یونیورسٹی میں نام لکھواتے اور پڑھتے تو آج ملک کی بڑی شخصیتوں میں سے ایک ہوتے ——!"

یہ لوگ اپنا تمام وقت افسوس کرنے اور "گزشتہ کل کی قبر" پر آنسو بہانے میں ضائع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر آج بھی وہ ہوش کے ناخن لیں تو ممکن ہے کہ وہ اپنی تمام یا چند آرزوؤں کی تکمیل کر لیں لیکن وہ اس کی بجائے اپنے ماضی پر افسوس ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔ ؎

وقتِ گزشتہ را نتوانی خرید باز
مفروش خیرہ کاین گہر پاک بی بہاست

(گزرا ہوا وقت تم دوبارہ نہیں خرید سکو گے اس لیے وقت کو نہ بیچنا بہتر ہے۔ وقت ایک صاف شفاف انمول موتی ہے)

بعض لوگ ایسے لوگوں کے برعکس ہوتے ہیں۔ ان کو مستقبل کی اتنی فکر ہوتی ہے کہ اضطراب کے مارے وہ موجودہ وقت میں کوئی کام نہیں کر پاتے۔ ہم نے ایسے طلبہ کو دیکھا ہے جو ہمیشہ امتحان میں بیٹھنے سے روک دیے جانے کا خوف رکھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کہتے رہتے ہیں کہ:

"کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا سال ضائع ہو جائے کہیں
ایسا نہ ہو کہ ہم امتحان میں قبول نہ کیے جائیں۔"

یہ اضطراب ان کو مطالعہ اور کام کرنے نہیں دیتا اور ان کی فرصت ختم ہو جاتی ہے۔ عربی میں کیا خوب شعر ہے کہ ؎

مافات مضیٰ وما سیاتیک فاین
قم فاغتنم الفرصة بین العدمین

(جو وقت گزر گیا، وہ تو گزر گیا اور جو وقت آئے گا وہ ابھی موجود کہاں ہے؟ پس کھڑے ہو جاؤ اور دو معدوم وقتوں کے درمیان کی فرصت کو غنیمت جانو)

شیریں زبان سعدی بھی اس بارے میں کہتے ہیں کہ ؎

سعد یا دی رفت و فردا ہمچنان موجود نیست
درمیان این و آن فرصت شمار امروز را

(اے سعدی کل تو چلا گیا، آنے والا کل بھی اسی طرح موجود نہیں ہے۔ پس ان دو کلوں کے درمیان آج ہی کی فرصت کو غنیمت سمجھو)

جوانی کا زمانہ فرصت کا بہترین زمانہ ہے

کام کرنے، علم حاصل کرنے اور پیسہ جمع کرنے کے لیے بہترین وقت، جوانی کا زمانہ ہے۔ زندگی کا بلند ترین نقطہ، جوانی کا زمانہ ہے۔ اپنی زندگی میں ایک جوان کسی ایسے کوہ پیما کی طرح ہوتا ہے جس نے ہمالیہ کی چوٹی سر کر لی ہو اور خوشی سے وہ اپنی کھال میں نہ سما رہا ہو۔

ایک جوان آدمی میں عشق، امید، جوش، ولولہ اور کام کرنے اور نئی نئی چیزیں بنانے کی صلاحیتیں بہت ہوتی ہیں۔ اور ایک مدت کے بعد اس کی روحانی اور جسمانی طاقتیں کم ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اعصاب میں وہ طاقت نہیں رہتی۔ آنکھ کا نور کم ہو جاتا ہے۔ نئی نئی چیزیں بنانے کی صلاحیت کمزور پڑ جاتی ہے۔

مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"انسان کو اپنی جوانی اور تندرستی کی اہمیت کا اندازہ ان کے ختم ہو جانے کے بعد ہوتا ہے۔"

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ایک عظیم صحابی "ابوذر" کو جو نصیحتیں کیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ:

"اس سے پہلے کہ بڑھاپا تم پر طاری ہو تم جوانی کی اہمیت کو جان لو۔"

زینتِ باغ است درختِ جوان
پیر شود برکندش باغبان

شاخِ جوان بہر گلی نو بر است
شاخہ پیر، از پی خاکستر است

(جوان درخت باغ کی زینت ہوتا ہے۔ اگر وہ بوڑھا ہو جائے تو مالی اسے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ جوان شاخ ہر پھول کے لیے نیا پھل پیش کرتی ہے اور بوڑھی شاخ مرجھا جانے کے لیے ہوتی ہے۔)

عظیم اور کامیاب لوگ کبھی بھی ماضی پر افسوس نہیں کرتے۔ اور انھیں مستقبل کا اضطراب مناسب وقت میں کام کرنے سے روک نہیں سکتا۔

خدا نے انسان میں ایک عقلِ طبیعی پیدا کی ہے جو کہ تمام افراد میں عمر کے بڑھنے کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ لیکن اس عقلِ طبیعی کے ساتھ ساتھ علم اور تجربوں کی روشنی میں ہم ایک عقلِ اکتسابی حاصل کرتے ہیں۔ عقلِ اکتسابی درحقیقت عقلِ طبیعی کی پرورش کرتی ہے اور اسے کمال تک پہنچاتی ہے۔

بالفرض ہمارے پاس پستے کے دو درخت ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سے نو کلو پستہ حاصل ہوتا ہے لیکن اگر ہم ایک کو کیمیائی کھاد فراہم کریں تو اس سے دگنا پستہ پیدا ہوگا۔

کامیاب لوگ وہی ہوتے ہیں جو ہمیشہ مختلف فرصتوں میں خواہ وہ بچپن ہو، جوانی ہو یا بڑھاپا۔ فطری یا طبیعی عقل کو اکتسابی یا کسبی عقل سے پروان چڑھاتے ہیں اور اس کام کے لیے بہترین فرصت جوانی کا زمانہ ہے۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

"فرصت، بہار کے ابر کی طرح سے جلد گزر جاتی ہے"

کامیابی اس کسان کا حق ہے جو اس سے فائدہ
اٹھائے۔"

جن لوگوں نے اپنے وقت اور اپنی عمر کی اہمیت پہچان لی ہے وہ اپنے قیمتی وقت کو بیہودہ کاموں میں ضائع نہیں کرتے۔ بعض دانشوروں نے اپنی کتابیں ایسے اوقات میں لکھیں جن اوقات کو عام لوگ اہمیت نہیں دیتے۔ مثلاً ڈاکٹر "مارڈن کوڈ" نے اپنی ایک کتاب اپنے ایک مریض کے گھر سے دوسرے مریض کے گھر جانے کے دوران لکھی۔

ڈاکٹر "یورنی" نے فرانسیسی اور اطالوی زبانیں اپنے دفتر جانے اور آنے کے دوران سیکھیں۔

فقید علم و ادب مرحوم مدرس خیابانی نے اپنی ایک اہم کتاب ناشتہ کے دوران لکھی جو کہ فارسی زبان کے مترادف الفاظ کے بارے میں ہے۔

"نپولین" نے "اریکولا" کے واقعہ میں صرف پچیس سواروں کے ساتھ دشمن پر فتح حاصل کی۔ کیونکہ دشمن تھکا ہوا تھا۔ نپولین نے اس فرصت کو غنیمت جانا اور اپنی کم تعداد کے باوجود وہ دشمن پر حاوی رہا۔

بعض لوگ اپنی عمر اس طرح ضائع کر دیتے ہیں کہ گویا وہ اپنی عمر اور اپنے وقت کے دشمن ہیں۔ آج کل بہت سی سرگرمیاں ایسی ہیں کہ ان میں تفریح سے زیادہ وقت کو ضائع کرنے کا سامان ہوتا ہے۔

البتہ تھکے ہوئے اعصاب کو تفریح کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہرگز کسی تفریح کو وقت کا ضیاع نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ گھومنا پھرنا، تازہ ہوا میں

سانس لینا، خوبصورت مناظر دیکھنا، خوشی کی محفلوں میں شرکت کرنا، یہ سب چیزیں ہمارے اعصاب کو تھکن سے نجات دلاتی ہیں اور زندگی کی گاڑی کو چمکا دیتی ہیں۔

لیکن ہر قسم کے بے ہودہ اور وقت ضائع کرنے والے کام کو تفریح سمجھ کر اپنی قیمتی عمر کو برباد نہیں کرنا چاہیے۔

آجکل کے جوان تفریح کے لیے سینما، ٹیلیویژن، رسالوں، اخباروں اور ڈائجسٹوں کا سہارا لیتے ہیں۔ حالانکہ ان کو یہ جاننا چاہیے کہ ہر فلم دیکھنے کے قابل نہیں ہوتی اور ہر کتاب سبق آموز، خوش کرنے والی اور مفید نہیں ہوتی۔

جرائم کے بارے میں ڈرا دینے والی فلمیں اور عشق اور جنس کی باتیں تعریف کے لائق نہیں ہیں بلکہ جوانی کے غنچہ کو کھلنے سے پہلے ہی مرجھا دینے کا سبب ہیں۔

عزمِ صمیم

انسان کے پاس دیگر حیوانات کی طرح "ارادہ" کی طاقت بھی ہوتی ہے دیگر حیوانات کا ارادہ ان کی "حیوانی جبلّت" کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جبکہ انسان کے ارادہ کو "عقل" کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔

ہم اس حصّے میں پکّے ارادے کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ یہاں ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ ہم ارادہ کی لگام نفسانی خواہشات کے ہاتھ میں دے دیں اور ہر کام کو اپنی حیوانی فطرت کے مطابق انجام دیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں ہماری حیثیت ایک حیوان سے زیادہ نہیں رہے گی۔ اور اس طرح ہم اپنی منزلت سے گر جائیں گے۔

یہاں ہمارا مقصد یہ ہے کہ ——

فائدہ اور نقصان پر غور و خوض اور تشخیص کے بعد اگر عقل نے پسند کیا تو ہم اس کے مطابق ارادہ کر لیں اور اس پر مقدور بھر قائم اور

ڈٹے رہیں۔ ہم کو یہ جان لینا چاہیے کہ ہر کام میں جس حد تک مشکلات اور سختیاں ہوتی ہیں، اسی حد تک ہم کو اپنے ارادے میں پختگی اور طاقت درکار ہوتی ہے اور کامیابی کا راز پکا ارادہ ہے جو کہ مشکلات کو راستے سے ہٹا دیتا ہے۔

عظیم لوگوں کا قیافہ اور ان کے چہرے کے نقوش ان کے پکے ارادے کی نشاندہی کرتے ہیں اور کامیابی ان کے قیافہ اور طور طریقوں کے آسمان سے برستی ہے۔

مضبوط ارادہ رکھنے والے افراد ہمیشہ ہر طبقہ میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور دوسرے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ لیکن کمزور ارادے والے افراد ہمیشہ آوارہ کتوں کی طرح کمزور ہوتے ہیں اور دشمن ان پر چھا جاتا ہے۔

تردد اور "تذبذب" کامیابی کے لیے ایک بلا ہے اور اخلاقی کمزوری کی واضح علامت ہے۔ تذبذب، ہوش اور اعلیٰ ذہانت پر کاری ضرب لگاتا ہے۔

سکندر اعظم کہتا تھا کہ:

"میری کامیابی کا ایک راز میرا پکا ارادہ ہے۔
فیصلہ کر لینے کے بعد اس میں پس و پیش کرنا
مجھے پسند نہیں۔"

تیمور لنگ، نپولین اور نادر شاہ، دنیا کے مانے ہوئے فوجی لیڈر تھے۔ یہ لوگ دیر سے فیصلہ کرتے تھے لیکن جب فیصلہ کر لیتے تھے تو اپنے فیصلہ سے پھرتے نہیں تھے۔

مصمم ارادہ رکھنے والا شخص، ڈیوٹی پر موجود فوجی کی طرح سے ہوتا ہے

جسے تیار رہنے کا حکم مل چکا ہو۔ ایسا شخص حالات سے ٹکرا جاتا ہے اور مشکلات اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔ ہدف کے راستے کی سختیاں اس کی نظر میں ممکن چیز کو ناممکن ظاہر نہیں کر سکتیں۔

"گوئٹے" کہتا ہے کہ

"پختہ ارادہ رکھنے والا شخص دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کر سکتا ہے۔"

جنگ "قادسیہ" میں ایرانی فوج کے کمانڈر انچیف رستم فرخ زاد نے مسلمانوں کے سپہ سالار سے مسلمانوں کا ایک نمائندہ طلب کیا۔ مسلمانوں کے سپہ سالار "سعد بن وقاص" نے "ربعی بن عامر" کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ عرب کے اس صحرا نشین شخص کے پختہ ارادے نے رستم کو مبہوت اور مرعوب کر دیا۔

جب وہ رستم کے دربار میں وارد ہوا تو اس نے دیکھا کہ رستم سونے کے تخت پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کے دربار میں اعلیٰ قالین بچھے ہوئے ہیں جن پر سونے کے تاروں سے مزین تکیے رکھے ہیں۔

ایک با ارادہ مرد کے سامنے ان دھوکا دینے والی چیزوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ یہ چیزیں دیکھ کر اس کے ارادے کی پختگی میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی۔

جب وہ رستم کے دربار کے قریب پہنچا تو وہ گھوڑے پر سوار ہی رہا۔ بلکہ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی وہ رستم کے اصطبل میں وارد ہوا۔ ملازموں نے اسے اس حالت میں وارد ہونے سے

روکنا چاہا تو اس نے کہا :

" تم لوگوں نے ہم میں سے ایک نمائندہ طلب
کیا تھا۔ میں مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت
سے آیا ہوں۔ اگر تم لوگ نہیں چاہتے تو میں واپس
چلا جاؤں گا۔"

پھر انتہائی وقار اور اطمینان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا وہ رستم کے تخت کے نزدیک پہنچا۔ قالینوں پر چلتے ہوئے آگے بڑھا اور خاک پر جا کر بیٹھ گیا اور کہا کہ :

" ہمیں ان زیوروں کی عادت نہیں۔"

رستم کے ترجمان نے مسلمانوں کے اس نمائندے سے پوچھا کہ مسلمان فوج نے حملہ کیوں کیا تھا تو اس نے جواب میں کہا :

" خدا نے ہماری یہ ذمہ داری قرار دی ہے کہ ہم خدا
کے بندوں کو دنیا کے ظلم و ستم اور دیگر مذاہب
کی خرابیوں سے نجات دلائیں اور انھیں اسلام کا
قانون قبول کرنے کی ہدایت دیں۔ اگر انھوں نے
ہماری بات قبول کر لی تو ہم کو ان سے کوئی دشمنی
نہیں ہوگی۔ ورنہ ہم ان سے جنگ کریں گے خواہ
ہم قتل کریں یا قتل ہو جائیں۔ ہر صورت میں ہم بہشت
میں پہنچیں گے۔"

اس صحرانشین مرد کے پکے ارادے اور سختی کو دیکھ کر رستم بہوت رہ گیا۔ اس نے کہا :

"ہمیں مہلت دیجیے کہ ہم اپنے بزرگوں کے ساتھ
خط و کتابت کریں اور مشورہ لیں۔"

مسلمانوں کے نمائندہ نے کہا:

"ہم تین روز تک مہلت دے سکتے ہیں۔ اس سے
زیادہ تاخیر درست نہیں ہے۔"

رستم نے کہا:

"معلوم ہوتا ہے کہ تم ہی سپہ سالار ہو۔ جبھی ہمارے
ساتھ معاہدہ کرنے کی جرأت رکھتے ہو۔"

اس نے کہا کہ:

"نہیں، میں تو مسلمانوں میں کا ایک فرد ہوں البتہ
تمام مسلمان مل کر ایک ہی بدن کے اعضا ہیں۔ اگر
ان میں سے ایک نے امان دی تو دوسروں پر بھی لازم
ہے کہ وہ اس امان کو تسلیم کریں۔" [1]

امیر المومنینؑ اپنے فرزند کو پختہ ارادہ کا حکم دیتے ہیں

جنگِ جمل جو کہ حضرت علی علیہ السلام اور معاہدہ توڑنے والوں کے درمیان چھڑی تھی، اس جنگ میں حملہ کرنے کے لیے امیر المومنینؑ نے پرچم اپنے عزیز بیٹے محمد حنفیہ کو دیا اور ان کے ارادے کو قوی کرنے کے لیے چند جملے کہے۔ انھوں نے فرمایا:

---

[1] تاریخ کامل ابن اثیر۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۳۰

"اگرچہ بصرہ کے اطراف کے پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں
مگر تم اپنی جگہ سے پسپا نہیں ہونا۔
اپنے دانتوں کو بھینچ لینا۔
اپنا کاسۂ سر اللہ کو عاریت دے دینا۔
لشکر کی آخری صفوں پر اپنی نظر رکھنا۔
اپنی آنکھ ہر قسم کی پریشانی کو دیکھنے سے بند کر لینا۔ اور اپنے پختہ
ارادے کی مخصوص طاقت سے ان پریشانیوں کو کالعدم سمجھنا۔ جان لو کہ آخر کار
کامیابی خدا ہی کی طرف سے ملتی ہے۔ ہماری ذمہ داری بس یہ ہے کہ خدا نے ہمیں
جو طریقہ بتایا ہے اسی طریقے سے ہم جنگ کریں۔" [1]

امیر المومنینؑ نے اپنے ایک سردار (مالک اشتر) کو مصر کا گورنر مقرر
کر کے بھیجا۔ مصر کے لوگوں کے نام ایک خط میں انھوں نے اس سردار کی اس طرح
تعریف کی:

"اے مصر کے لوگو! میں نے اللہ کے بندوں میں
سے ایک بندہ تمھاری طرف بھیجا ہے جو خطرے
کے دنوں میں سوتا نہیں اور خوف کی گھڑیوں میں
دشمن سے ڈرتا نہیں۔ یہ برے کام کرنے والوں کے
لیے جلا دینے والی آگ سے بھی زیادہ سخت
ہے ..... یہ اللہ کی تلواروں میں سے
ایک تلوار ہے جس کی دھار کند نہیں ہوتی اور

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۱۱

جس کا وار خالی نہیں جاتا۔" [1]

خود متقیوں کے مولا حضرت علی علیہ السلام ارادے کی قوت اور فیصلے کی پختگی کے اعتبار سے بہت عظیم تھے۔ اپنے ایک گورنر کو خط میں لکھتے ہیں کہ:

"خدا کی قسم! اگر تمام عرب ایکا کر کے مجھ سے بھڑنا چاہیں تو بھی میں اُن کو پیٹھ نہیں دکھاؤں گا۔" [2]

ہم صرف اس صورت میں اپنے ہوش، اپنی ذہانت اور زمین میں پوشیدہ قیمتی معدنیات سے استفادہ کر سکتے ہیں جبکہ ہمارے پاس ایسا پکا ارادہ ہو جو ٹوٹ نہ سکتا ہو۔ کیونکہ انسان اپنے فولادی ارادہ کی روشنی ہی میں آگے بڑھ سکتا ہے۔

"خود اعتمادی" یہی تو ہے کہ انسان عقل کی رہبری میں، پکے ارادے کی روشنی میں فیصلہ کرے اور اس کے مطابق کام کرے۔ خود کو کام کے انجام دینے پر قادر سمجھے اور ارادے کو کمزور کر دینے والی باتوں سے سنجیدگی کے ساتھ پرہیز کرے۔

دنیا بھر کی سیاحت کرنے والے، مثبت سوچ رکھنے والے لوگ اور علوم اور صنعتوں کی داغ بیل ڈالنے والے لوگ ایسے تھے جنھوں نے اپنی زندگی کی لغت سے "نہیں ہو سکتا" اور "میں نہیں کر سکتا" جیسے الفاظ حذف کر دیے تھے۔ وہ ہر چیز کو "میں کر سکتا ہوں" اور "ہو سکتا ہے"

---

[1] نہج البلاغہ۔ مکتوب نمبر ۳۸

[2] نہج البلاغہ مکتوب نمبر ۴۵

کی نظر سے عقل کی رہبری میں دیکھتے تھے۔ منفی سوچ رکھنے والا اور کمزور ارادے والا شخص نہ صرف یہ کہ مفید فرصتوں سے استفادہ نہیں کرسکتا بلکہ ایسا شخص ہمیشہ دوسروں کے کام میں رکاوٹ بنتا ہے اور اپنی باطنی طاقت کو کام نہ کرنے اور رکاوٹیں ایجاد کرنے میں ضائع کر دیتا ہے۔

ارادے کو پختہ کرنے کا ایک باعث کام اور ھدف سے عشق اور کام میں شوق ہے۔ سب سے پہلے تو انسان کو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اپنے کام میں دلچسپی اور شوق پیدا کرے۔ خواب ہو یا بیداری، ہر حال میں کام ہی کا خواب دیکھے۔ یہاں تک کہ اس کی فکر خود بخود ہر وقت کام کی طرف مائل ہونے لگے۔

اہرام مصر، کسریٰ کا محل، شاندار عمارتیں، سینکڑوں جلدوں پر مشتمل کتابیں۔ نہ ٹوٹنے والے ارادوں ہی کے آثار ہیں۔

روس اور امریکہ کے لوگوں کی خلابازی، ان کے پکے ارادے کی وجہ سے اوج پر ہے۔

بے ارادہ شخص اس کاغذ کی مانند ہوتے ہیں جو سمندر کی سطح پر بہہ رہے ہوں اور ان کی اپنی کوئی طاقت نہ ہو۔ لیکن مصمم ارادہ رکھنے والے اشخاص ان ماہر تیراکوں کی مانند ہوتے ہیں جو اپنے ارادے اور بدن کی حرکت کی روشنی میں جس طرف سے چاہیں پانی کو چیر کر آگے بڑھتے ہیں۔

نپولین کہتا تھا کہ "نہیں ہوسکتا" کا لفظ زندگی کی لغت سے حذف ہو جانا چاہیئے۔ "نہیں ہوسکتا" "میں نہیں کرسکتا" اور

"میں نہیں جانتا" جیسی باتیں سُن کر وہ بہت ناراض ہوتا تھا۔ اور کہتا تھا:
"تم چاہو، ہو جائے گا۔"

آجکل بہت سی بیماریوں کا علاج، ارادہ کو تقویت پہنچا کر کیا جاتا ہے۔ بہت سی مشکلات، ارادے کی طاقت کے آگے بے بس ہو جاتی ہیں۔

حافظ شیرازی کے بقول ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بسی
شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

(لیلیٰ کے گھر کے راستے میں بہت خطرے ہیں۔ پہلا قدم آگے بڑھانے کے لیے شرط یہ ہے کہ تمھیں مجنوں ہونا چاہیے)

ماحول سے واقفیت

ہر کام سے پہلے زمانے کے حالات اور تقاضوں کو اچھی طرح پہچان لینا چاہیے اور اس کے بعد حالات کے مطابق پروگرام ترتیب دینا چاہیے۔ حالات کی روش کا مطالعہ کیے بغیر کاموں کا آغاز، اکثر اوقات بے نتیجہ ثابت ہوتا ہے۔

اس بارے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ:

"اَلْعَالِمُ بِزَمَانِہٖ لَا تَھْجُمُ عَلَیْہِ اللَّوَابِسُ۔"

"جو شخص اپنے زمانے کے حالات سے واقف ہو جائے وہ ناگہانی یلغار سے بچ جاتا ہے۔"

یہ ایک نہایت گراں بہا اصول ہے۔ اگر مسلمان اور دنیا کی دیگر

پس ماندہ قومیں، ملکی سیاست کے سلسلے میں، اس بنیادی اصول کی طرف توجہ دیتیں تو وہ ہرگز فاتح قوموں سے مغلوب نہ ہوتیں۔ بہت سی بدبختیاں زمانے کے حالات سے ناواقفیت اور بے اعتنائی کی وجہ سے واقع ہوتی ہیں۔

اسلام کی آمد سے قبل مغربی روم میں، علوم وفنون، صنعت وحرفت اور جنگی شعبوں میں ذرہ برابر ترقی نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ دنیا کے حالات سے اس قدر بے خبر تھے کہ جب مسلمان فوج نے "قسطنطنیہ" کا محاصرہ کیا تو وہاں کے دانشور ایک بیہودہ مسئلہ پر بحث کر رہے تھے اور وہ مسئلہ یہ تھا کہ:

"سوئی کی نوک پر چند فرشتے اپنے
لیے جگہ بنا سکتے ہیں یا نہیں۔"

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ مسلمانوں میں یہ سستی اس وقت پیدا ہوئی جب وہ ترقی وکمال کے بلند مراتب پر فائز تھے۔ مشرقی ممالک خصوصاً اسلامی ممالک کے سربراہ اپنے عوام کے حالاتِ زندگی سے بُری طرح غافل تھے وہ اس وقت بیدار ہوئے جب یورپ تمام علوم اور صنعتوں پر اپنا قبضہ جما چکا تھا۔

عثمانی حکومت کی یورپی قوموں کے مقابلے میں مسلسل شکست نے بھی عثمانی حکومت کو لمحہ بھر کے لیے بیدار نہیں کیا۔ حکومت کے سربراہ غفلت میں پڑے رہے۔ جب ان کی نگاہ دشمن کے ہوائی جہازوں پر پڑی جو فضا کو دہلائے دے رہے تھے۔ تو وہ لوگ ایک حیرانی کے عالم میں انھیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ یہ انسان کا کام ہوگا۔ وہ یہی تصور کرتے رہے کہ یہ فرشتوں اور پریوں کی حرکتیں ہیں۔

انیسویں صدی ایجادات اور صنعتی ترقی کے اعتبار سے بہت درخشاں صدی تھی۔ لیکن ایران اس زمانے میں داخلی کشمکشوں میں مبتلا تھا۔ حکومت کا انتظام سنبھالنے والے اس قدر خواب خرگوش میں مست تھے کہ انھیں اس بات کی بالکل خبر نہیں تھی کہ دنیا کے دوسرے حصّوں میں کیا ہو رہا ہے۔

مثال کے طور پر اس بات کا تذکرہ کوئی عیب نہیں کہ :

فتح علی شاہ کی حکومت کے زمانے میں "نپولین" ہندوستان فتح کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس زرخیز ملک کو برطانوی کمپنی کے پنجے سے چھین لے۔ اس کے لیے اس نے ایران کے عوام اور حکومت کی حمایت حاصل کرنے کی خاطر بادشاہ ایران کو ایک خط لکھا۔

حیرانی کی بات ہے کہ بادشاہ کے دربار میں کوئی شخص ایسا نہیں ملا جو نپولین کے خط کا ترجمہ کر سکے۔ دوسرے ممالک کے سفارتخانوں سے ترجمہ کرانے میں مصلحت نہیں سمجھی گئی۔ مجبوراً بغداد میں ایران کے سفارتخانے کو وہ خط بھیجا گیا وہاں ایک فرانسیسی جانے والا شخص تھا جس نے اس کا ترجمہ کیا۔[1]

ایسی سوئی ہوئی قوم، اپنی سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی آزادی کو محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ ہمیشہ اسے غیر قوموں سے وابستہ ہو کر زندگی گزارنی پڑتی ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک بڑے ایرانی شاعر نے اپنے غم و اندوہ کے شعلوں کو ان اشعار میں ڈھالا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ؎

---

[1] گوشہ و کنار تاریخ

مائیم کہ از پادشاہان باج گرفتیم
زآن پس کہ ازایشان کمر و تاج گرفتیم

دیہیم و سریر از گہر و عاج گرفتیم
اموال و ذخایر شان تاراج گرفتیم
واندیشہ نکردیم زطوفان وزتیار

درچین وختن ولولہ ازہیبت ما بود
درمصر و عدن غلغلہ ازشوکت ما بود

دراندلس و روم عیاں قدرت ما بود
غرناطہ و اشبیلیہ در طاعت ما بود

صقلیہ نہاں درکنف رایت ما بود
فرمان ہمایون قضا آیت ما بود
جاری بزمین و فلک وثابت وسیار

(ہم وہ ہیں جنھوں نے بادشاہوں سے ٹیکس وصول کیا
اس کے بعد ہم نے ان سے کمر کا پٹہ اور تاج لے لیا۔ شاہی
ٹوپی اور موتی اور ہاتھی دانت سے مزین شاہی تخت
لے لیا۔ ہم نے ان کے خزانوں کو تاراج کردیا۔ اور ہم نے
طوفانوں اور تند ہواؤں سے خوف محسوس نہیں کیا۔
چین اور ختن میں ہماری ہیبت کا چرچا تھا۔ مصر اور
عدن میں ہماری شان وشوکت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

اندلس اور روم میں ہمارا اقتدار ظاہر تھا۔ غرناطہ اور
اشبیلیہ ہماری اطاعت کرتے تھے۔ صقلیہ ہمارے پرچم
کے سائے میں چھپا ہوا تھا۔ شاہی فرمان ہماری نشانی تھا
جو کہ زمین آسمان اور ہر ساکن اور متحرک چیز پر
حکم فرما تھا۔)

یہ اشعار اس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جب مسلمان اور ایرانی حضرات بیدار اور چاق و چوبند تھے یا بہتر طور پر یوں کہا جائے کہ مشرقی اسلامی دنیا کے قابل فخر ماضی سے مربوط ہے۔

لیکن آج ہماری کیا حالت ہے۔ یہی شاعر اس کو یوں بیان کرتے ہیں:

افسوس کہ این مزرعہ را آب گرفتہ
دہقان مصیبت زدہ را خواب گرفتہ

خونِ دلِ ما رنگِ مئ ناب گرفتہ
وز سوزش تب پیکرِ ما تاب گرفتہ

رخسارِ ہنر، گونہ مہتاب گرفتہ
چشمانِ خرد، پردہ ز خوناب گرفتہ

ثروت شدہ بے مایہ و صحت شدہ بیمار

(افسوس کہ اس کھیت کو سیلاب نے تباہ کر دیا مصیبت زدہ
کسان سو گیا۔ ہمارے دل کے خون نے خالص شراب کا
رنگ اختیار کر لیا۔ بخار کی گرمی سے ہمارا پیکر جل گیا۔

ہنر کا چہرہ، چاند کے چہرے میں تبدیل ہوگیا عقل کی آنکھوں
پر خون کا پردہ پڑ گیا۔ ثروت کی کوئی حقیقت نہیں رہی
اور صحت بیمار ہوگئی۔)

پوپ کا ادارہ

پوپ کا بڑا ادارہ ایک طولانی ظالمانہ حکومت کے بعد درہم برہم ہوگیا۔ کیونکہ اس نے — Inquisition — نام کا ایک حلقہ تشکیل دے کر اپنے عالمگیر اقتدار کو محفوظ رکھنا چاہا تھا۔ لیکن وہ سخت دھوکے میں تھا۔ وہ ان تبدیلیوں سے غافل تھا جو عوام میں راسخ ہوگئی تھیں۔ یہ تبدیلیاں پادریوں کے غلط افکار کو خاک کا ڈھیر بنانا چاہتی تھیں۔ چرچ نے ان تبدیلیوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

اس کا خیال تھا کہ تنبیہ و تادیب اور زور و زبردستی سے وہ اس سیلاب کا راستہ مسدود کر دے گا لیکن اس کا یہ خیالِ خام حالات میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے عدم واقفیت کی بنا پر تھا۔

اگر وہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں ایک نیا لائحہ عمل اختیار نہ کرتا اور خود کو زمانے کے حالات کے مطابق نہ ڈھالتا تو آج دنیا میں عیسائیت کا نام و نشان باقی نہ ہوتا۔

اس نے اپنی خواب آلود آنکھوں کو صاف کیا، اپنا راستہ تبدیل کیا۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا اور معاشرتی اور علمی خدمات کے ذریعے اپنی سابقہ حیثیت کو دوبارہ حاصل کر لیا۔

مشرق کا انتہائی ذہین آدمی

انیسویں صدی میں عوام کے طبقات میں سے ایک انتہائی ذہین آدمی (امیر کبیر) اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے احساس کیا کہ اہلِ مشرق کی بدبختی ان تبدیلیوں کی وجہ سے ہے جو مغرب میں نمودار ہوئی ہیں۔ ان تبدیلیوں نے مشرق اور مغرب کی دو قوموں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر رکھی ہے۔ جب تک یہ خلیج پاٹی نہ جائے اس وقت تک مغربی قوم کی ایران پر اجارہ داری باقی رہے گی۔

اس نے زمانے کے حالات کا اچھی طرح مشاہدہ کیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب تلوار اور تیر سے جنگ کرنے کا موقع نہیں ہے۔ مشینوں، صنعتوں اور عظیم کارخانوں نے پیداوار کا انداز بدل کر رکھ دیا ہے۔ گیس اور بھاپ نے تمدن مادی ذخیروں کی سرکشی کو روک رکھا ہے۔

اس لیے امیر نے ۱۸۴۹ عیسوی بمطابق ۱۲۶۶ھ قمری کے شروع میں "دارالفنون" نامی ایک ادارے کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس عمارت کا مشرقی حصہ ۱۲۶۷ھ قمری کے آخر تک مکمل ہوا۔

اس نے قابل بھروسہ افراد کو "وین" بھیجا۔ پیدل فوج کا ایک استاد، توپخانہ کی فوج کا ایک استاد، سوار فوج کا ایک استاد، ریاضی کا ایک استاد، معدنیات کا ماہر ایک استاد، دو عدد کان کن، ایک علم طب اور جراحی پڑھانے کا استاد، اور ایک دوائیاں تیار کرنے والا شخص ملک آسٹریا سے پانچ یا چھ سال کے لیے طلب کیا۔ اور ان میں سے ہر شخص کو سالانہ "چار ہزار" تومان (ایرانی کرنسی کا نام) تنخواہ ادا کی۔

لیکن افسوس کہ ملت کے اس درخشندہ چراغ کو گل کرنے کے لیے قوم

کے غدار حرکت میں آ گئے اور انھوں نے اس چراغ کو خاموش کر دیا۔ "امیر کبیر" دارالفنون کے آغاز کے کچھ عرصہ بعد ہی ۱۲۶۸ھ قمری میں قاچار کے جلادوں کے ہاتھوں قتل کر دیے گئے۔

امیر کبیر نے دنیا کے حالات کا دقت سے مطالعہ کر کے جان لیا تھا کہ ایران اور دیگر پس ماندہ ممالک کی بدبختی کی ایک بڑی وجہ مغرب سے وابستہ اقتصاد ہے۔ ایران مغرب میں تیار کی گئی چیزوں کا بازار بن کر رہ گیا ہے۔ اور ہم ان چیزوں کو خرچ کرنے والے بن کر رہ گئے ہیں۔

یہ وابستگی یا بہتر لفظوں میں یہ بے چارگی اور گدائی، ایران کی صنعتوں اور ایرانیوں کی صلاحیتوں کو بالکل ختم کرنے کا سبب بن گئی ہے۔

ایرانی، مغربی صنعتوں کے لیے خام مال فراہم کرنے والے بن کر رہ گئے ہیں۔ اور ایک مزدور کی طرح سے روزانہ کی آمدنی پر گزارہ کرتے ہیں۔

امیر نے صنعتوں کو وسعت دینے کے لیے کافی سرمایہ اہل فن کے اختیار میں دیا تھا۔

"ساری" میں شکر تیار کرنے کے، تہران میں رسّی اور کپڑا بُننے کے، کاشان میں ریشمی کپڑا تیار کرنے کے اور اصفہان اور تہران میں سماور اور گھوڑا گاڑی بنانے کے کارخانے قائم کیے تھے۔

اصفہان اور کاشان کے کپڑا بُننے والوں کی کافی مدد کی تھی اور جدید مصنوعات اور ایجادات کے لیے انھوں نے ماہرین کی ہمت بندھائی۔ نیز ایران کی قومی صنعت کی مصنوعات کی ایک نمائش تہران میں منعقد کی۔

امیر کبیر کی یہ تمام خدمات، کام سے واقفیت اور زمانے کے حالات سے آشنائی ہی کی بدولت تھیں۔

جب ایران میں پکی سڑک اور آٹو موبائیل گاڑیوں کا رواج ہوا تو گھوڑے گدھے اور کجاوے پر سفر کی رونق ختم ہوگئی۔ کجاوہ اٹھانے والوں نے واویلا مچانی شروع کی۔ عجیب بات یہ ہے کہ انھوں نے حکومت وقت سے درخواست کی کہ وہ کجاوہ داروں کے کام کا لائسنس ضبط کرے۔

یہ باتیں دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبری کا نتیجہ تھیں۔

کبھی ہمارے تاجر ایسے کام کرنے لگتے ہیں جنھیں آج کی دنیا میں پسند نہیں کیا جاتا۔ حقیقت میں ان کا یہ عمل ترقی کے خلاف جنگ کے مترادف ہے اس کے نتیجے میں وہ یقینی شکست سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

یہاں پر ہمیں ایک عظیم پیشوا کی ایک بات کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

انھوں نے فرمایا:

"لَاتُعَادُوا الْاَیَّامَ فَتُعَادِیَکُمْ"

"زمانے سے جنگ نہ کرو، ورنہ زمانہ تم سے لڑے گا۔"

دشمن ترقی کا ایک زینہ ہے

کامیاب شخص وہی ہے جس نے زمانے کو اچھی طرح پہچان لیا ہو۔ اور جو اپنے رقیب اور دشمن کو ترقی کا زینہ سمجھے۔

دانشور، دشمن کو انسان کی کامیابی کا وسیلہ شمار کرتے ہیں۔

کیونکہ دشمن ایک ایسا بہترین آئینہ ہے جو ہمارے عیبوں کو زبان یا قلم کے ذریعے منعکس کرتا ہے ——— ہمارے تخوت اور غرور کو کم کرتا ہے — اور کبھی ہماری چھپی ہوئی صلاحیتوں کو اُبھارنے میں مدد کرتا ہے۔

مشرق و مغرب کی ترقیاں، رقابت (Competition) کا نتیجہ ہیں۔ اگر رقابت ختم ہو جائے تو صلاحیتیں پھول کی طرح نہ کھلیں۔ اس لحاظ سے اگر افراد یا لوگوں کی اصناف کے درمیان رقابت ختم ہو جائے تو نئی نئی چیزیں بنانے اور ایجادات کا سلسلہ واضح طور پر سُست پڑ جائے۔

ناکامیاں، کامیابی کا زینہ ہیں

کامیابی کا ایک راز یہ ہے کہ ہم شکست سے نہ ڈریں۔ بلکہ شکست کے درخت سے میٹھا پھل چُن لیں۔ شکست زندگی میں ایک آئینہ کی طرح ہے جو عیبوں اور کوتاہیوں کا واضح عکس بغیر کسی کمی بیشی کے ہمیں دکھا دیتی ہے۔

عظیم اور صاحبِ نظر افراد، ناکامی کو "کامیابی کا پُل" سمجھتے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ آئندہ شکست کے اسباب نہ دہرائے جائیں۔ درحقیقت وہ ہار جانے کو شکست نہیں سمجھتے بلکہ وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں اس شکست سے ان کی روح نہ ہار مان جائے۔

تاریخ کے صفحات بتاتے ہیں کہ بہت سی کامیابیاں، ناکامی کے بعد حاصل ہوئی ہیں۔ کیونکہ شکست کھانے والے ایک زندہ روح اور ایک نئے عزم کے ساتھ دوبارہ کام کے میدان میں وارد ہوتے ہیں اور اس طریقے سے

خود کو کامیابی کے آستانہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ جانتے تھے کہ ناکامی اور کامیابی کے درمیان فاصلہ بہت کم ہے۔

ہار جانے والے لیکن ہار نہ ماننے والے، شکست کے موقع پر بیٹھ نہیں جاتے، بلکہ خراماں خراماں آگے بڑھتے رہتے ہیں اور آخر کار منزل مقصود پر پہنچ کر دم لیتے ہیں۔

جنگ احد میں ایک نافرمانی کے نتیجہ میں مجاہدینِ اسلام کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن یہ شکست اتنی سبق آموز تھی کہ آئندہ کی تمام کامیابیاں اسی کی رہین منت تھیں۔

نپولین کہتا ہے کہ:

"میں نے اتنی ناکامیوں کا سامنا کیا ہے کہ مجھے شکست دینے کا طریقہ آگیا ہے۔"

اور کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ:

"ناتوان لوگوں کے لیے شکست مار ڈالنے والا زہر ہے اور توانا روحوں کے لیے کامیابی کا زینہ ہے۔"

اسلام کے مقدس آئین میں ناامیدی کو گناہِ کبیرہ شمار کیا گیا ہے۔ شکست کا ظاہری اثر ناامیدی ہوتا ہے۔ لیکن پرانے زمانے سے لوگ کہتے چلے آرہے ہیں کہ:

"سیاہ رات کے اختتام کے بعد روشنی ہوتی ہے۔"

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نامرادیوں میں کبھی مراد چھپی ہوتی ہے، ناامیدی

میں کبھی امید پوشیدہ ہوتی ہے۔

ایران کے عظیم فوجی لیڈر نادر شاہ نے عثمانی ترکوں سے کرمان شاہ حاصل کرنے کے بعد بغداد کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے سامرہ، کربلا، نجف اور عراق کے کچھ اور شہروں پر قبضہ کیا اور پھر بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن جلد ہی "توپال شاہ" اسّی ہزار چنے ہوئے ترک فوجیوں کے ساتھ محاصرہ توڑنے پہنچ گیا۔

عثمانی ترکوں کی یہ فوج بھاری توپوں سے لیس تھی۔ تعداد کے لحاظ سے بھی وہ ایرانیوں سے زیادہ تھے۔ جنگ کے دوران نادر شاہ کے گھوڑے کو ایک تیر لگ گیا۔ اور وہ خون میں لوٹ پوٹ ہو گیا۔

ایرانی فوجیوں نے خیال کیا کہ نادر شاہ مارا گیا ہے۔ پھر کیا تھا ان میں انتشار اور بدنظمی پھیل گئی۔ نادر شاہ نے جب یہ حال دیکھا تو پسپائی اختیار کرنے کا حکم دیا۔ اس جنگ میں تیس ہزار ایرانی اور بیس ہزار عثمانی ترک قتل ہوئے۔ نادر شاہ کا پورا توپخانہ اور تمام اسلحہ عثمانیوں کے ہاتھ آیا۔ نادر شاہ باقی ماندہ فوج کے ساتھ "مندلی" پہنچا۔ اور حال یہ تھا کہ اس کے فوجیوں کے پیروں میں جوتے تک نہ تھے۔

عام لوگوں کے لیے یہ شکست، کام کا خاتمہ شمار ہوتی تھی۔ لیکن جس کام نے نادر شاہ کو نجات دلائی وہ یہ تھا کہ اس نے شکست کو قبول نہیں کیا۔ اس کی روح ابھی زندہ تھی۔

ہمدان واپس لوٹ کر اس نے پورے ملک سے جنگجو افراد کو جمع کیا اور دو ماہ کے اندر ایک منظم اور باقاعدہ فوج تیار کر لی جس میں دو لاکھ سے کم فوجی نہیں تھے۔

اس کے بعد وہ کرمان شاہ گیا۔ وہاں سے وہ کرکوک پہنچا۔ عثمانی ترکوں

کو سخت شکست دی۔ پھر بغداد کا دوبارہ محاصرہ کیا۔ عثمانی فوجیوں کو اس نے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں عثمانی حکومت کو وعدہ کرنا پڑا کہ دس سال کے اندر اندر تمام ایرانی زمینیں، ایران کو واپس دے دی جائیں گی۔

ایرانی بادشاہ کڑوے درخت سے میٹھا پھل چنتا ہے

"بہرام شاہ" شکار کا بہت شوقین تھا۔ لیکن اپنی رعایا کے حالات سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ صرف منظم فوج کی پریڈ اور اپنے درباریوں کی چاپلوسی کو دیکھ کر خوش ہو جاتا تھا۔ اس کو بے گناہ قیدیوں کے بارے میں اطلاع تک نہیں تھی۔

ایسے حالات میں ملک کی سرحدوں پر جنگ چھڑ گئی۔ وہ عوام سے مدد طلب کرنے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن عوام نے اس کی بات پر کان نہ دھرے اور اس کا ساتھ نہ دیا۔

بادشاہ یہ دیکھ کر حد سے زیادہ متاثر ہوا۔ اس نے سوچنا شروع کیا کہ عوام کے ہاتھوں اس کی اس شکست کا سبب کیا ہے۔ اس نے سمجھ لیا کہ حکومت کے انتظامات میں کہیں ایسی گڑبڑ ہے۔ جس کی اسے خبر نہیں اور یہی گڑبڑ عوام کو حکومت سے بیزار کر رہی ہے۔

ایک دن وہ لباس اور حلیہ بدل کر شہر سے باہر گیا۔ اس نے اچانک دیکھا کہ ایک شخص نے اپنے خیمے کے سامنے ایک کتے کی کھال لٹکا رکھی ہے۔ ایرانی بادشاہ آگے بڑھا۔ سلام کیا، خود کو ایک مسافر ظاہر کیا اور کتے کی کھال لٹکانے کا سبب پوچھا:

بہت اصرار کرنے پر اس شخص نے اس طرح جواب دیا:

"میری زندگی میں گزرا وقات چند بھیڑوں پر ہوتی تھی، جو ان سبزہ زاروں میں چرا کرتی تھیں اور یہ کتا جس کی کھال یہاں لٹکی ہوئی ہے، ان بھیڑوں کی حفاظت کرتا تھا۔ میں اور میرا چرواہا بے فکری کے ساتھ اپنے کام کو وسعت دینے کی سوچ رہے تھے لیکن چند روز بعد چرواہا آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ آج ایک بھیڑ کو بھیڑیوں نے کھا لیا۔ اس کے بعد مسلسل دو تین روز تک ایسی ہی خبر ملنے لگی۔ میں کتے سے بدگمان ہو گیا۔ میں نے اور چرواہے نے مل کر رات بھر کتے کی نگرانی کی۔ ہم نے دیکھا کہ کتے نے چند مادہ بھیڑوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کیے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی شہوت پوری کرنے کے لیے مادہ بھیڑیوں کو بھیڑوں پر حملہ کرنے دیتا ہے۔ ہمیں یہ نقصان اسی وجہ سے ہوا تھا کہ ہم نے کتے پر حد سے زیادہ اعتماد کیا تھا۔ میں نے فوراً کتے کا سر کاٹ دیا اور اس کی کھال یہاں لٹکا دی تاکہ لوگ جان لیں کہ اگر کوئی کسی ذمہ داری کو سنبھالتا ہے اور اپنے کام میں خیانت کرتا ہے تو اس کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

اس داستان نے بادشاہ کے ذہن میں ایک بجلی سی دوڑا دی۔ اس نے خود سے کہا کہ شاید میری شکست کا سبب درباریوں پر میرا حد سے زیادہ اعتماد ہے۔ اس کے بعد اس نے درباریوں کو اطلاع دیے بغیر عوام کے مختلف طبقوں سے

ملاقات کی۔ اس نے دیکھا کہ لوگوں کی آہیں ان کے سینوں میں روک دی گئی ہیں۔ اور بیگناہ افراد کو غیر قانونی ٹیکس نہ دینے کے جرم میں قید خانوں میں ڈال دیا گیا ہے۔

اس نے فوراً ایک بنیادی انقلاب سا برپا کر دیا۔ درباریوں، وزیروں اور دیگر عہدیداروں کو تبدیل کر دیا۔ ظلم کرنے والوں کو سزا دی اور اس طرح عوام کی حمایت حاصل کر لی۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد ملک کے ہر حصہ سے بادشاہ وقت کی حمایت ہونے لگی۔

ہٹلر کی شکست

ہٹلر کو شکست، فرانس کے عظیم جرنیل "نپولین" کی شکست کی طرح ہوئی۔ نپولین انتہائی سخت سردی میں ماسکو فتح کرنے نکلا تھا۔ اس بنا پر اسے کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ اس کے زوال کا سبب بنا۔

اگر ہٹلر، نپولین کی شکست سے عبرت پکڑتا تو اس کی غلطی کو خود نہ دہراتا۔ ہٹلر نے سخت گرمی میں ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو روس پر حملہ کر دیا۔ اس کو بھی تقریباً وہی نتیجہ دیکھنا پڑا جو نپولین کو نصیب ہوا تھا۔

ابتدا میں تو جرمن فوجیوں کو کامیابی نصیب ہوئی اور اتحادیوں نے پسپائی اختیار کی۔ جرمن فوج نے ان کا تعاقب کیا۔ لیکن آگے چل کر سخت گرمی کی وجہ سے "لینن گراڈ" جیسے شہروں کا محاصرہ کرنے میں جرمن فوجیوں کو بہت مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ روس نے ان پر زبردست حملے کیے اور انھیں شکست کا سامنا ہوا۔ [1]

---

[1] "حوادثِ بزرگِ تاریخ" صفحہ ۲۷۸

شجاعت و بے باکی

"بے باکی" اور "بہادری" یہ دو لفظ ایک ہی حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں اور دونوں کامیابی کے بنیادی رکن شمار کیے جاتے ہیں۔

یقیناً "بے باکی"، "گستاخی اور لاپرواہی" سے مختلف چیز ہے۔ اسی طرح "بہادری" اور "بے قاعدگی" میں بہت فرق ہے۔

بے باکی اور بہادری، مردانگی کی علامت ہیں۔ اور بہت سے کاموں میں یہ دونوں چیزیں کامیابی کے ایک پُل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بلکہ تمام "ترقیاں" اور معاشرتی اور فکری انقلابات، بے باکی اور بہادری کے بغیر ممکن نہیں ہیں۔

بزدل اور ڈرپوک افراد سردی کے مارے ہوئے پرندوں کی طرح ایک گوشے میں چھپ جاتے ہیں۔ اپنے لوگوں یا دشمن کے خوف سے کوئی کام اپنے ہاتھ میں نہیں لیتے۔ ایسے لوگ نہ تو ناقابل فراموش ہوتے ہیں اور نہ ہی زندگی میں کوئی تبدیلی لاسکتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر بہت ہی تیر ماریں تو اپنی موجودہ حالت

کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔

لیکن بے باک اور بہادر افراد پہلے مقصد کی اہمیت کو سمجھتے ہیں، ہر پہلو سے کام پر غور کرتے ہیں، کام کے نفع نقصان کا اندازہ لگا کر پروگرام بناتے ہیں اور پھر کچھ پرواہ کیے بغیر کام شروع کر دیتے ہیں۔

یہیں پر گستاخی اور جنون آمیزی اور بے باکی اور بہادری میں فرق قائم ہوتا ہے۔ بے پرواہ افراد، سوچے سمجھے بغیر کام شروع کر دیتے ہیں۔ اپنے اقدام کے نفع نقصان پر نظر نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ اگر کوئی پروگرام بنائیں بھی تو دنیا کے سمجھدار لوگ اسے پسندیدہ قرار نہیں دیتے۔ ایسے لوگ اپنے زورِ بازو کا فریب کھا جاتے ہیں، اپنی طاقت پر گھمنڈ کرنے لگتے ہیں۔

اب ہم یہاں تاریخ کا ایک واقعہ بیان کر کے اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہیں:

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد "مسیلمہ" نام کے ایک شخص نے یمن میں نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ مسلمان فوجی اس کو سرکوب کرنے کے لیے مدینہ سے یمن پہنچے۔ "مسیلمہ" کے سپاہی منتشر ہو گئے۔ لیکن وہ خود اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ ایک بڑے باغ میں پہنچ کر محفوظ ہو گیا۔ اس باغ کی بھی چار دیواری تھی اور یہ باغ ایک قلعہ کے بیچ میں بنا ہوا تھا۔ اور اس قلعہ میں زندگی کی ضروریات، ہر اعتبار سے چند مہینوں کے لیے کافی تھیں۔

مسلمان فوجی چند روز تک قلعہ کے اطراف میں پڑے رہے۔ لیکن کچھ نہیں ہو سکا۔ مشہور مسلمان فوجی سالار ابو دجانہ کی سربراہی میں ایک میٹنگ بلائی گئی۔ میٹنگ میں سب سے پہلے تو درپیش کام کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی کہ اگر مسیلمہ گرفتار نہ ہوا تو محاصرہ ختم ہونے کے بعد وہ پھر

اپنی فریب کاریوں سے لوگوں کو اپنی طرف مائل کر کے گمراہ کرے گا۔ اور یوں ایک بڑے نقصان کا سبب بنے گا اور اگر اس کی گرفتاری میں چند مجاہدین شہید ہو جائیں تو یہ بھی ایک اہم بات ہے۔

اس کے بعد مسیلمہ کی گرفتاری کے طریقوں پر گفتگو ہوئی۔ "ابو دجانہ" نے کہا کہ:

"میں دس جانباز سپاہی چاہتا ہوں جو اس مقصد کے لیے اپنی جان دینے پر آمادہ ہوں۔"

فوراً دس جانبازوں نے اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا۔ پھر "ابو دجانہ" نے کہا کہ:

"یہ دس آدمی جن میں، میں بھی شامل ہوں، ایک ایک کر کے ڈھال کے اوپر بیٹھیں گے۔ دوسرے فوجی اپنے نیزوں کے ذریعے ڈھال کو اوپر بلند کریں گے یہاں تک کہ ڈھال پر بیٹھے ہوئے آدمی کا ہاتھ قلعہ کی دیوار کے اوپر پہنچ جائے۔ جب اس طرح سب لوگ دیوار پر پہنچ جائیں گے تو رسیوں کی مدد سے قلعہ کے اندر داخل ہوں گے سب سے پہلے میں رسی لٹکاؤں گا، اندر جاؤں گا قلعہ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کروں گا۔ اگر میرے ساتھی دیکھیں کہ میں مارا گیا ہوں تو دوسرا اسی طرح وارد ہو گا، اگر اسے بھی شہادت نصیب ہو تو تیسرا شخص اندر اترے گا۔ اس طرح چند

افراد کی جانبازی کے نتیجہ میں کوئی نہ کوئی دروازے
تک پہنچ ہی جائے گا اور مسلمان فوج کے لیے
دروازہ کھول دے گا۔"

اتفاق سے ابو دجانہ نے اکیلے ہی یہ سب کام کر لیا۔ انھوں نے رسی لٹکائی اندر اترے، مختصر سی جنگ کے بعد وہ قلعہ کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اس طرح فساد کا آخری اڈہ "مسیلمہ" کی گرفتاری اور پھر اس کے قتل کے بعد ختم ہو گیا۔

اگر ابو دجانہ اس قدر بے باکی کا مظاہرہ نہ کرتے تو ہرگز مسلمانوں کو فتح نصیب نہ ہوتی۔

اسپین کی فتح کے موقع پر "موسیٰ بن نصیر" جو افریقہ میں مسلمان فوج کے سالار تھے، نے یورپ فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ انھوں نے اپنے غلام "طارق بن زیاد" کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ جاسوسی کی غرض سے اسپین روانہ کیا۔

جب طارق اسپین پہنچے اور دشمن کے جذبات کا ہر پہلو سے اندازہ لگایا تو دیکھا کہ وہ لوگ حملہ کے لیے آمادہ ہیں۔ طارق بن زیاد نے سوچا کہ اگر وہ اپنی رپورٹ سپہ سالار کو بھیجیں اور ان کے حکم کے منتظر رہیں تو ممکن ہے دشمن بیدار ہو جائے۔

طارق نے فوج کو حکم دیا کہ ان کشتیوں کو جن میں بیٹھ کر سمندر عبور کیا ہے جلا دیا جائے۔ جب کشتیاں جلنے لگیں تو بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ:

"آپ نے کشتیوں کو آگ لگوا کر ہمیں بے بس کر
دیا ہے، اب ہم اپنے گھر واپس نہیں لوٹ سکتے۔"

طارق نے جواب دیا کہ:

"مسلمان مرد کسی پرندہ کی طرح نہیں ہے کہ اس کا
ایک مخصوص آشیانہ ہو۔"

اس کے بعد وہ اٹھے، اس پہاڑ کے دامن میں کھڑے ہو گئے جسے آج "جبل الطارق" کہا جاتا ہے۔ سمندر کی موجیں تھپیڑے مار رہی تھیں۔ انھوں نے ایسی زوردار تقریر کی کہ کان ان ہی کی آواز سن رہے تھے اور سمندر کا شور گویا خاموش ہو گیا تھا۔

طارق ابن زیاد نے کہا:

"اے لوگو!

ٹھاٹھیں مارتا سمندر تمھارے پیچھے ہے اور
دشمن کی فوج تمھارے سامنے۔ تمھارے دشمنوں
کے پاس راشن اور اسلحہ کے انبار لگے ہوئے ہیں
لیکن تمھارے پاس وہی غذا ہے جسے تم دشمن کے
ہاتھوں سے اپنے طاقتور پنجوں میں لے سکو۔
تمھارے پاس کمر سے لٹکی ہوئی ان تلواروں کے
علاوہ اور کوئی اسلحہ نہیں ہے۔"

اس ولولہ انگیز تقریر نے مسلمان فوجیوں میں ایک ہیجان برپا کر دیا اور ان کی رگوں میں خون جوش مارنے لگا۔ انھوں نے انتہائی بہادری سے مختصر سی مدت میں دشمن کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ اور اس طرح اسپین فتح ہوا۔

عیسائی مذہب کی اصلاح کے سلسلے میں مارٹن لوتھر کی جرأت

چرچ کے پادریوں کے خوف کی بنا پر عوام کی آہیں ان کے سینوں میں گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ کسی کو جرأت نہیں تھی کہ پوپ اور اس کے اطراف کے پادریوں پر معمولی سی تنقید بھی کر سکے۔

"مارٹن لوتھر" ۱۵۱۰ء میں روم گیا۔ اس نے دیکھا کہ بڑے عہدوں پر فائز پادری، مذہبی رسوم اور وظیفوں کو ادا کرنے میں لاپرواہی برتتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مذہبی اصلاحات کے سلسلے میں اس کا عزم مزید پختہ ہو گیا۔

آخر کار ۱۵۱۷ء میں اس نے ایک اعلان چرچ کے دروازے پر چسپکا دیا۔ اور عوام کو اطلاع دی کہ اس کے پاس کچھ "نکتے" ہیں اور وہ انھیں صاحبِ رائے افراد کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے۔

"لوتھر" نے اپنے تمام نکات میں مذہبی رہنماؤں کے طور طریقوں پر سخت اعتراض کیا۔ اس نے کہا کہ لوگوں کی نظروں میں محترم ہو کر وہ ان کے گناہ بخش دینے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مارٹن نے پادریوں کی اس حرکت کو ایک قسم کا سوءِ استفادہ قرار دیا۔

اس کی اس تنقید پر چرچ کے بڑوں کو سخت غصہ آیا۔ انھوں نے اسے خبردار کیا کہ وہ اپنی ان ناپسندیدہ اور "ناہنجار" باتوں سے باز آجائے۔ لیکن اس نے اس تنبیہ کا کوئی اثر نہیں لیا اور محفلوں اور مجلسوں میں احتجاج اور استدلال پیش کرتا رہا۔

ویٹکن نے مجبور ہو کر اس کے کافر ہو جانے کا فتویٰ صادر کیا۔ اس نے

پوپ کے اس فتوے کو برسرِعام جلا کر راکھ کر دیا۔ اور فریڈرک" سوم کے پاس پناہ لی۔ لیکن اس نے اپنا کام جاری رکھا۔ آخر کار اپنی بے باکی اور جرأت کے نتیجہ میں اس نے عیسائی مذہب کی بعض غلط باتوں کو مذہب سے جدا کر کے دم لیا۔ اور" پروٹسٹنٹ" فرقہ کی داغ بیل ڈالی۔

اب تک جو مثالیں ہم نے پیش کیں وہ معاشرتی امور میں جرأت کے مظاہرے سے متعلق تھیں۔ لیکن آپ ذاتی امور میں بھی جرأت اور بے باکی کی بہت سی مثالیں تاریخ کے صفحات میں پڑھ سکتے ہیں۔

جو شخص بھی کامیابی کا خواہش مند ہے اسے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ :

زندگی کے کسی شعبے میں بھی کامیابی کا حصول
بغیر ہمت و شجاعت کے ناممکن ہے ـــــ!

اگر آج ہمارے معاشرہ کی اصلاح نہایت سست روی اور آہستگی سے ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی کی بنیاد محض دفاع پر قائم ہے۔ ہم آگے بڑھنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ بہادر اور جری افراد ہمارے درمیان انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

جن افراد میں جرأت نہیں ہوتی وہ اپنی موجودہ حالت کو قائم رکھنے کی خاطر ہاتھ پاؤں چلاتے ہیں۔ ان کی نظر میں ترقی کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ اگر ان کی زندگی میں کوئی موڑ آتا بھی ہے تو وہ اس سے استفادہ نہیں کرتے۔

بے باک افراد کی زندگی میں جب کسی بہتری اور تبدیلی کا امکان نظر آتا ہے تو وہ زحمتیں برداشت کر کے بھی حالات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

یہ جان لینا چاہیے کہ ہر ترقی اور ہر تبدیلی کے لیے تکلیف اور زحمت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر دکھ درد بھی موجود ہوتے ہیں۔ بچہ اگر ماں کے پیٹ سے دنیا میں آنا چاہے تو زندگی کے اس موڑ پر اسے ایک تنگ راستے سے زحمتوں کے ساتھ گزرنا پڑے گا تاکہ زیادہ وسیع افق پر وہ اپنی زندگی کی بساط پھیلا سکے۔

بے باک افراد، زندگی کے کسی موڑ پر جب پہنچتے ہیں تو ہر قسم کی مصیبت ہنستے ہوئے برداشت کر لیتے ہیں۔

دیکھا گیا ہے کہ بہت سے افراد اپنی موجودہ حالت پر راضی نہیں رہتے لیکن کیونکہ ان میں جرات نہیں ہوتی اس لیے وہ ترقی اور بہتری کے سلسلے میں سختیوں کو برداشت نہیں کر پاتے۔ اس طرح وہ جہاں ہیں وہیں رہ جاتے ہیں اور عمر بھر روتے پیٹتے رہتے ہیں۔

ایثار و فداکاری

اعلیٰ اور مقدس مقاصد کی اہمیت عقل سلیم کے حامل افراد کی نظر میں جان و تن اور مادی منصب اور مقام سے زیادہ ہے۔ ایسے مقاصد میں کامیابی اسی کا حق ہے جو اپنے مقصد کی راہ میں اپنی زندگی اور دیگر مادی چیزوں کی پرواہ نہ کرے۔

اگر کسی شخص نے مقدس اہداف کو اپنے جسم و جان کے لیے یا مادی ترقی کے لیے پانا چاہا تو یہ ایک دیوانگی ہوگی۔ کیونکہ مقدس اہداف ایثار کے طلبگار ہوتے ہیں اور ایثار کا مطلب ہے زندگی سے گزر جانا۔ اور مادی چیزوں کے لیے زندگی سے ہاتھ دھو لینا جنون ہے۔

لیکن اگر کسی شخص کو مذہبی مقاصد سے اتنا عشق ہو کہ وہ اسے جان و تن اور اپنی مادی زندگی سے زیادہ عزیز ہوں تو ایسی صورت میں ایثار، یعنی جان، مال، اولاد، خاندان اور مادی حیثیت کو کھو دینا کامیابی کی علامت سمجھا جائے گا۔

جو لوگ زندگی کو مادّہ پرستی کی عینک سے دیکھتے ہیں اور ہر چیز کو مادّہ ہی کی خاطر چاہتے ہیں وہ لوگ پیغمبروں، مقدس رہبروں اور اماموں، عظیم لوگوں، مخلص سیاستدانوں، اور مذہبی اور روحانی مقاصد رکھنے والے لوگوں کے ایثار کی صحیح وجہ نہیں بتا سکتے۔

ہو سکتا ہے کہ مادّہ پرست لوگ اس ایثار کو افسانہ سمجھیں اور ایسے جانبازوں پر پاگل ہونے کی تہمت لگا دیں۔

لیکن جو شخص اپنے ھدف کو مادّی زندگی سے زیادہ اہمیت دیتا ہو، وہ اسی میں اپنا آرام و سکون محسوس کرتا ہے کہ اس کا مقصد پورا ہو جائے۔ وہ مسکراتے چہرے اور دلی جذبات کے ساتھ خود کو خطرناک حادثات کے منہ میں لے جاتا ہے۔

اگر حضرت عیسیٰؑ نے اتنی زحمتیں جھیلیں، یہودیوں کی لعن طعن سنی تو یہ سب ایک مقدس مقصد کی خاطر تھا جسے وہ اپنی جان سے بڑھ کر سمجھتے تھے۔

امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ کا شب ہجرت بستر رسولؐ پر سونا اسی ایثار کا مظہر تھا۔

اگر سید الشہداء امام حسینؑ نے اپنے اور اپنے باوفا ساتھیوں کے خون سے سرزمین کربلا کو رنگین کیا تو یہ بھی ہدف سے عشق کا نتیجہ تھا۔ ان کی نظر میں شرافت کے ساتھ پر افتخار موت ذلت کی زندگی سے بہتر تھی۔ ان کی منطق یہی تھی کہ:

"سرخ موت، سیاہ زندگی سے بہتر ہے"

اگر جنگ "نہروان" میں ایک جوان اپنے اختیار سے امیر المومنینؑ

سے قرآن لے کر دشمن کی طرف گیا اور ان کو کتابِ خدا کی طرف دعوت دی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے دشمن کے تیروں سے چھلنی کر دیا جائے گا تو یہ بھی مقصد سے اس کے عشق کی وجہ سے تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ حق باطل پر کامیاب ہو جائے۔

اگر "کولمبس" نے امریکہ دریافت کیا تو یہ اس کا ایثار تھا جو اس میں موجود تھا۔ وہ ایک ماہر جہاز ران تھا۔ چودہ سال کے سن ہی سے کئی بار وہ بحیرۂ روم کا سفر کر چکا تھا۔

"کولمبس" نے ۳ اکتوبر ۱۴۹۲ء کو تین جہازوں کے ایک بیڑے کے ساتھ سمندر کا سفر شروع کیا۔ ان تین جہازوں کے نام "سانتا" "ماریا" اور "نینا" تھے۔ بہت تکلیفوں، ہولناک سمندری طوفانوں، بیماری اور جہازوں کے کارکنوں کی ناراضگی کو جھیلنے کے بعد آخر کار وہ ۱۲ اکتوبر کو امریکہ کی سرزمین پر اترا۔

اگر چھ اپریل ۱۹۰۹ء کو "رابرٹ اڈوین پیری" قطب شمالی پہنچا تو یہ اس کا ایثار تھا۔ یہ امریکی جہاز ران اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ انتہائی سخت زحمتیں برداشت کر کے قطبِ شمالی پہنچا۔ کپتان خود "پیری" تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر حساب کتاب کر کے قطب کا صحیح مقام معین کیا۔ اس کے بعد وہ چھتیس گھنٹے تک آرام کرتا رہا۔ "پیری" کے پیر کی انگلیاں سردی کی وجہ سے بالکل ناکارہ ہو گئیں۔ اس کے ساتھی "میٹ ھنسن" نے اس کے آرام کے دوران اس کے ایک پیر کی چار انگلیاں کاٹ دیں۔ واپسی کے سفر میں اس کے دوسرے پیر کی پانچوں انگلیاں ناکارہ ہو گئیں۔

مشکلات و مصائب

زندگی کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں طوفان بھی ہیں اور پہاڑوں جیسی بلند موجیں بھی۔ حادثات اور حالات کی تند و تیز موجیں، عظیم لوگوں کی زندگی کی راہ میں رکاوٹ بننا چاہتی ہیں۔ کامیابی انھیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو عقل و تدبیر کی کشتی کے ذریعے حالات کے سینے کو چیر کر اپنے لیے راستہ بنائیں۔ اور علم اور بصیرت کے چپوؤں کے ذریعے مشکلات کے سمندر کا مقابلہ کریں۔ اور اس کے لیے وہی ثابت قدمی درکار ہوگی جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ مشکلات کا وجود خود کامیابی کا ایک سبب ہے یہ بات بعض لوگوں کے لیے قابل ہضم نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ غور کریں تو دیکھیں گے کہ جس طرح آگ کی تپش لوہے کو اور مضبوط بنا دیتی ہے۔ اسی طرح مشکلات اور مصیبتیں انسان کی فکر کو مزید پختہ کر دیتی ہیں اور اسے زندگی کا سبق سکھاتی ہیں۔ قوی اور طاقتور افراد وہ ہیں جنھوں نے زحمتوں کی آغوش میں پرورش

پائی ہو۔ کیونکہ ایسے ہی لوگ مصیبتوں کے طوفانوں کو جھیلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن جنھوں نے نعمتوں کے گہوارے میں پرورش پائی ہو وہ ایسے نازک پھولوں کی طرح ہیں جو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے مرجھا جاتے ہیں۔ اور ہوا کا جھکڑ چلے تو اپنی جگہ سے ٹوٹ جاتے ہیں۔

مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام کہ جو قوتِ بازو، عظمتِ روح اور حالات کے مقابلہ میں ثابت قدمی کے لیے ضرب المثل ہیں بصرہ کے والی عثمان بن حنیف کے نام اپنے خط کے ایک حصہ میں اپنی سادہ غذا کا تذکرہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ :

> " میں سمجھتا ہوں کہ تم میں سے کوئی یہ کہے گا کہ جب ابن ابی طالبؑ کی خوراک یہ ہے تو ضعف و ناتوانی نے اسے حریفوں سے بھڑنے اور دلیروں سے ٹکرانے سے بٹھا دیا ہوگا۔ مگر یاد رکھو کہ جنگل کے درخت کی لکڑی مضبوط ہوتی ہے اور تر و تازہ پیڑوں کی چھال کمزور اور پتلی ہوتی ہے اور صحرائی جھاڑ کا ایندھن زیادہ بھڑکتا ہے اور دیر میں بجھتا ہے۔" [1]

دریا کے کنارے پرورش پانے والے درخت نعمت و آرام میں رہتے ہیں۔ مشکلات و مصائب کے عادی نہیں ہوتے۔ لیکن بیابان کے درخت مشکلات کی آغوش میں پروان چڑھتے ہیں۔ وہ مصیبتوں کے فرزند ہوتے ہیں۔ ان کی پرورش جھلسا دینے والی دھوپ، گرم ہواؤں اور پانی کی قلت میں ہوتی ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ۔ مکتوب نمبر ۴۵

جو قومیں پہاڑوں کے دامن میں رہتی ہیں وہ ان قوموں سے زیادہ قوی اور طاقتور ہوتی ہیں جو شہروں اور قصبوں میں زندگی گزارتی ہیں۔ پہاڑوں کے دامن میں رہنے والے لوگ اگرچہ کہ زندگی کے وسائل سے محروم رہتے ہیں لیکن وہ شہریوں سے زیادہ سردی گرمی اور مشکلات کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔

مصیبت اگر سر پر ہو تو انسان اسے ہٹانے کے لیے اپنی ذہنی صلاحیت استعمال کرتا ہے اور ایک سے ایک ترکیبیں سوچتا ہے۔ درحقیقت مشکلات چارہ جوئی اور حل تلاش کرنے کی صلاحیت کو ابھارتی ہیں۔ اور اس کا شوق دلاتی ہیں اور شوق ترقی کی سیڑھی ہے۔

سائنس اور صنعت کی دنیا میں نام پیدا کرنے والی عظیم شخصیتیں زندگی بھر سختیوں اور محرومیوں کا شکار رہی ہیں۔

اسی وجہ سے نپولین کہتا تھا کہ:

"سختیاں اور تکلیفیں انسان کے ہوش کو مزید تیز کر دیتی ہیں اور اس طرح زیادہ بہتر نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔"

گوئٹے کہتا ہے کہ:

"حادثات کے طوفان، انسان کی روح اور اس کے اخلاق کو قوت بخشتے ہیں۔"

جن والدین کو ہمیشہ یہ فکر ہوتی ہے کہ ان کی اولاد، حالات کی سختیوں اور مصیبتوں میں مبتلا نہ ہو وہ اپنے بچوں کو نازک مزاج بنا دیتے ہیں، وہ سخت غلط فہمی کا شکار رہیں۔ ایسے بچے سخت حالات کے طوفان میں دریا کے کنارے اُگے ہوئے

بید کے درخت کی طرح ہوا کے ہر جھونکے پر لرز جاتے ہیں۔ مصیبتوں کے بگولے انھیں گھاس کے تنکوں کی طرح اِدھر سے اُدھر پھینک دیتے ہیں۔

لیکن جنھوں نے مصیبتیں اور زحمتیں برداشت کی ہوں وہ پہاڑ کی ان چوٹیوں کی مانند ہوتے ہیں جن کا ہواؤں کا زبردست طوفان بھی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ اسی طرح سیلاب ہمیشہ نرم زمینوں کو تباہ کرتا ہے لیکن سخت زمینوں پر اس کا کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔

سخت حالات کا سیلاب قوی اور سخت لوگوں کے آگے بے اثر ہو جاتا ہے۔ لیکن ناتوان افراد اپنے پیروں پر کھڑے نہیں رہ سکتے۔

زندگی میں مصیبتیں انسان کے لیے تجربات کا ایک ذخیرہ فراہم کرتی ہیں۔ اور مستقبل میں اس کی ترقی کا ایک وسیلہ بنتی ہیں۔ انسان تجربے مشکلات ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اور ان تجربوں کی روشنی میں وہ مسلسل ایسے کام کرتا ہے کہ سختیوں سے اسے فائدہ ہی حاصل ہو۔ وہ مشکلات کے پہاڑوں کو اپنے پیروں تلے روندتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ کوئی مشکل اس کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ جب مصیبتوں کے تیر اس پر برستے ہیں تو وہ سینہ سپر ہو کر خندہ پیشانی سے ان کا مقابلہ کرتا ہے۔

"نائیچے" کہتا ہے کہ:

"میں تجھ سے اتنی محبت رکھتا ہوں کہ تیرے لیے
رنج و غم کی آرزو کرنے لگتا ہوں۔ اس سلسلہ میں
تجھ پر رحم نہیں کرتا۔ کیونکہ میں تجھ سے محبت
رکھتا ہوں۔ تو جانتا ہے کہ کیوں ——— ؟!
اس لیے کہ میں چاہتا ہوں کہ تیری چھپی ہوئی صلاحیتیں

بیدار ہوں اور تو سخت حالات کا مسلح روح کے ساتھ
مقابلہ کرے۔"

ناصر خسرو کے بقول: ؎

تا نبیند رنج و سختی مرد، کی گردد تمام
تا نیاید باد و باراں، گل کجا بویا شود

(جب تک انسان رنج اور سختی نہ دیکھے اس وقت تک
وہ کب مکمل ہوتا ہے۔ جب تک ہوا نہ چلے اور بارش نہ ہو
اس وقت تک پھول میں خوشبو کہاں پیدا ہوتی ہے)

اگر ہم کہیں کہ اولاد کی کامیابی زحمت اور مشقت میں پوشیدہ ہے تو ہم نے کوئی فضول سی بات نہیں کہی۔ یا اگر ہم کہیں کہ فولاد آگ میں جا کر اور مضبوط ہو جاتا ہے اور چاقو، سوہان کے سخت دندانوں سے رگڑ کھا کر تیز ہوتا ہے تو یہ سب ایک ہی بات کی مختلف مثالیں ہیں۔

ایرانی قوم کا بہادر شخص "نادر شاہ" دنیا کا ایک مانا ہوا فوجی تھا۔ اس کی سمجھداری، اپنے کام سے واقفیت اور اس کا جذبہ یہ سب تاریخ کے صفحات میں ثبت ہیں۔ اس نے بدترین حالات میں کام کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ اس دور میں مٹھی بھر افغانیوں نے ایران کی قدیم قوم کو قدموں تلے جگہ دے رکھی تھی۔ عثمانی ترکوں نے ایران کے شمال مغربی حصے پر قبضہ کر رکھا تھا۔ ہالینڈ اور انگلستان نے ایران کے جنوب اور خلیج فارس کو اپنے تسلط میں لے لیا تھا۔ اور وہ لوگ چاہتے تھے کہ جنوبی ایران کو ایک دوسرا ہندوستان قرار دے دیں۔

"نادر شاہ" سے پہلے کے حاکم کے عیش و طرب اور ناز و نعم کی زندگی کی

وجہ سے ملک کا انتظام اس کے قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ لیکن پھر نادر جیسا مرد اٹھا جس نے جھلسا دینے والی دھوپ کے نیچے اور بیابانوں کی تپتی ہوئی ریت کے اوپر پرورش پائی تھی اور جس نے زندگی کے طوفانوں سے مقابلہ، جنگ اور شمشیر زنی کو اپنی عادت بنا لیا تھا۔ زندگی کے سخت حالات اور ایران کی ذلت آمیز کیفیت نے اس کے جسم و روح کو ایک پوری قوم کے جسم و روح کی طرح غضب ناک کر دیا تھا۔

نادر شاہ نے اپنی غضب ناک رُوح اور اپنے فولادی ارادے سے کام لے کر مملکتِ ایران کو دشمن کی گندگی سے پاک کیا اور اس طرح اس کا نام دنیا کے عظیم ترین فوجیوں میں گنا جانے لگا۔

سختیاں اور مشکلات، انسان کی شخصیت کو سنوارتی ہیں۔ کیونکہ انسان مشکلات کو دور کرنے کے لیے اپنی دماغی صلاحیت کو استعمال کرتا ہے۔ اسی وجہ سے دانشور لوگ کہتے ہیں کہ کھیل کود، بچوں کی دماغی صلاحیت کو ایک طرح سے ابھارتے ہیں۔ کیونکہ بچہ کھیل کے دوران، مشکلات کا سامنا کرتا ہے تو اپنی فکر کی طاقت کے ذریعے ان مشکلات کو دور کر دیتا ہے۔

اس اعتبار سے جب تک مشکلات کے طوفان نہ آئیں اس وقت تک بہت سی صلاحیتیں ابھر نہیں پاتیں۔ سختیاں اور مصیبتیں ایک سخت استاد کی حیثیت رکھتی ہیں جس کی وجہ سے امتحان کا نتیجہ بہت اچھا نکلتا ہو۔

مادّہ پرست اعتراض کرتے ہیں

وہ کہتے ہیں کہ خدا بہت مہربان ہے تو اس نے انسان کو بلاؤں کے درمیان کیوں گھیر رکھا ہے؟! ان سب مصیبتوں کا فلسفہ کیا ہے؟!

یہ مصیبتیں اور بلائیں، خدا کے عدل و انصاف اور رحم و کرم سے کس طرح سازگار ہیں، جس کا دعویٰ خدا پرست لوگ کرتے ہیں ؟!

لیکن ان مادہ پرست لوگوں نے ایک نکتہ سے غفلت برتی ہے اور وہ یہ کہ ان مصیبتوں اور بلاؤں کا ایک نفسیاتی فائدہ بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان جب تک مصیبتوں سے روبرو نہ ہو اس وقت تک اسے راحت اور تندرستی کی اہمیت کا علم نہ ہوگا۔

اس کے علاوہ معاشرے میں بڑھتے ہوئے ظلم و ستم کو روکنے کیلئے ان مصیبتوں کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ انسان کو اپنی زندگی میں ایک خطرے کی گھنٹی کی سخت ضرورت ہے۔ تاکہ وہ خود کو ظلم و ستم سے بچا سکے۔ اگر مصیبتیں نہ ہوں تو انسان خود پرست اور مغرور ہو جائے۔ اس لحاظ سے یہ آفتیں اور بلائیں دلوں کے زنگ کو دھو دیتی ہیں۔ اور دلوں کو مہر و محبت عطا کرتی ہیں۔

ہم کو کبھی یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ ہم مشکلات کے بغیر بھی بڑے سے بڑے مقصد کو پا سکتے ہیں۔

بہت سے سائنسدانوں نے مشکلات اور وسائل کی کمی ہی کی وجہ سے بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

مثلاً : "فرگوسن" نے چھوٹی سی چھری کی مدد سے لکڑی کی ایک گھڑی تیار کی تھی۔

"نیوٹن" نے ایک خوردبین اور ایک کاغذ کے ٹکڑے کے ذریعے روشنی کا تجزیہ کیا اور سات رنگوں کے اصول کو دریافت کیا۔

جب "ولسٹن" نامی فزکس کے ماہر کی تجربہ گاہ کا معائنہ کیا گیا تو چند بوتلوں، چند کاغذوں، ایک گھڑی اور ایک تھرمامیٹر کے علاوہ وہاں کچھ نہیں تھا۔

"فرگوسن" راتوں کو شہر سے باہر نکل جاتا تھا۔ میدان میں چت لیٹ جاتا تھا اور ستاروں کے درمیان فاصلوں کا اندازہ ایک تسبیح کی مدد سے لگاتا تھا۔

"وٹین ہاؤس" نامی مشہور ماہر فلکیات سورج گرہن اور چاند گرہن کا حساب زراعت میں استعمال ہونے والے نازک کاغذ کے دستے پر لگاتا تھا۔

سختیاں انسان کو مردانگی کی صفات سے آراستہ کرتی ہیں۔ زندگی کے تمام منصب اور روحانی یا مادی عہدے مشکلات کے رہین منت ہوتے ہیں۔ ان کے لیے ان مشکلات پر کامیابی حاصل کرنا لازمی ہوتا ہے۔

صائب تبریزی کہتے ہیں کہ :

مالش صیقل نشد آئینہ را نقص جمال
پشت پا ہر کس خورد، در کار خود بینا شود

(جب تک پالش نہ ہو اس وقت تک آئینہ میں نقص رہتا ہے۔ جو شخص بھی پیر کی مار کھائے وہ اپنے کام میں بینا ہو جاتا ہے۔)

واقعی اسی طرح ہے۔ جو لوگ اپنی زندگی کے آغاز ہی سے خوش قسمتی سے کامیاب رہے ہیں لیکن زمانے کی مصیبتوں سے گھبراتے ہیں۔ ان کی کامیابی برقرار رہنے کا امکان کم ہوتا ہے۔ لیکن جس جوان نے اپنی زندگی میں ناکامی بھی دیکھی ہو اور کامیابی بھی، اس کی زندگی کامیاب گزرنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ کیونکہ اس نے زندگی کے آغاز ہی سے مشکلات کا مقابلہ کرنا سیکھ لیا ہے۔

حقیقت پسندی

ہمیں چاہیئے کہ حقیقت جیسی ہے اس کو ویسی ہی سمجھیں۔ خواہ وہ حقیقت ہمارے فائدے میں تمام ہوتی ہو یا نقصان میں۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے کہ حقیقت کو ہر حال میں اپنے فائدے ہی میں سمجھیں۔

ہر شخص کو اپنی طاقت اور توانائی کی مناسبت سے حقیقت بینی کی عینک اپنی آنکھوں پر لگانی چاہیئے اور حالات کو بغیر کسی کمی بیشی کے محسوس کرنا چاہیئے ——!

معاشرے میں تباہی پھیلانے والے لوگ ہمیشہ اپنے نفس کو مطمئن کرنے کے لیے حقیقتوں کو توڑ مروڑ کر بیان کرتے ہیں۔ وہ خود کو اس طرح فریب دیتے ہیں کہ اپنی غلط بیانی ہی کو حقیقت سمجھنے لگتے ہیں۔ اس قسم کا سمجھنا اپنے نفس کو دھوکا دینے اور اپنے دل کو اندھا بنانے کی ایک قسم ہے۔

چھ اگست ۱۹۴۵ء کو دنیا کا پہلا ایٹم بم جاپان کے شہر "ہیروشیما"

پر پھینکا گیا۔ اس واقعہ کی وجہ سے جاپان کا یہ شہر دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اس دن اس واقعہ کے نتیجے میں جاپان کے ڈیڑھ لاکھ افراد متاثر ہوئے (ہیروشیما کی آبادی ۱۹۴۰ء میں تین لاکھ چوالیس ہزار تھی جو ۱۹۵۳ء میں گھٹ کر صرف دو سو چھیاسی رہ گئی)

اس کے تین روز بعد ایک اور بم "ناگاساکی" پر پھینکا گیا۔ جاپانیوں نے ایک ہفتہ کی خاموشی کے بعد ہار مان لی۔ ہزاروں معصوم بچوں، عورتوں اور بیگناہ مردوں کے اس بہیمانہ قتل عام نے دنیا بھر میں اس عمل کے خلاف نفرت کی ایک لہر سی دوڑا دی۔ انسانی تاریخ میں اس وحشیانہ عمل کی مثال نہیں ملتی۔ ان دو شہروں پر بمباری کرنے کا حکم "صدر ٹرومن" نے دیا تھا۔

اس حکم کے بعد وہ ضمیر کی خلش میں مبتلا ہوا اور صلح اور انسانیت سے محبت کرنے والوں نے ہر سطح پر اس کی مذمت کی۔ اس مذمت اور نفرت نے اس کی سیاسی اور عالمگیر حیثیت کو گھٹا دیا۔ دنیا نے اسے سیاستدان کہنے کی بجائے خونی قاتل کہا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ "ٹرومن" اس واقعہ کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟! کس طرح اپنے نفس کو دھوکا دیتا ہے اور سانپ کے زہر سے زیادہ تلخ حقیقتوں کو کس طرح اپنی ذات کی خاطر توڑ مروڑ کر بیان کرتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ:

> "میں نے یہ تاریخی فرمان لاکھوں امریکی فوجیوں کی نجات کے لیے صادر کیا تھا۔ اگر ان بموں سے کام نہیں لیا جاتا تو امریکی فوج کو جاپان کے ساحلوں پر حملہ کرنا پڑتا جہاں مضبوط دفاعی نظام موجود تھا۔

اس طرح سخت جنگ چھڑ جاتی اور خود جاپانیوں کا
بھی بہت نقصان ہوتا۔"

یہ جملے امریکہ کے ایک سابق صدر کے ہیں لیکن ایک معمولی عقل و فہم کا مالک انسان بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ ٹرومن اس غلط استدلال کے ذریعے صرف خود کو دھوکا دے رہا ہے۔ وہ حقیقت کو جیسی ہے ویسی سمجھنا نہیں چاہتا۔ اس اشتباہ کے ساتھ ساتھ اس نے یہ غلط تصور بھی کیا ہے کہ ابھی اس کا وقار اور اس کی ہر دل عزیزی باقی ہے۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس نے اپنی بے خبری کا نقصان بھگت لیا۔ دنیا کے آزادی کے دلدادہ لوگوں نے اسے سیاست کے میدان سے نکال باہر کیا۔ اور یہ دھبہ ہمیشہ کے لیے اس کے دامن پر لگا رہ گیا۔

تاجر، سیاستدان اور دیگر اصناف کے لوگ صرف اس صورت میں زندگی کے مختلف شعبوں میں کامیاب ہو سکتے ہیں جبکہ وہ اپنے حالات کو غیر جانبداری اور حقیقت پسندی کی نگاہ سے دیکھیں۔ تاجر کو چاہیے کہ معاملہ کے طریقے یا فروخت کے لیے پیش کی جانے والی چیز کے بارے میں گاہک کے اعتراضات غور سے سنے، اور صحیح تدبیروں کے ذریعے خامیاں دُور کرے۔

اسی طرح سیاستدان کو چاہیے کہ وہ عوام کے اعتراضات پر اچھی طرح غور کرنے سے پہلے ہی انھیں خود غرضی والی تحریکیں نہ سمجھے اور مختلف عنوانوں سے عوام کو مفسد اور بدامنی پھیلانے والوں کی طرح سے سرکوب نہ کرے۔ سیاستدان کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ حقیقت پسندی ہی ملک اور سیاست کی پائیداری کے لیے شرط ہے۔

ترقی چاہنے والا طالب علم، استاد کی ڈانٹ ڈپٹ بخوشی برداشت کر لیتا ہے۔ وہ کم نمبروں کو استاد کے جانبدار ہونے کی دلیل قرار نہیں دیتا۔ بلکہ وہ اپنا اور

اپنے علم حاصل کرنے کے طریقے کا محاسبہ کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حقیقت یہی ہو کہ کوتاہی اسی کی ہو۔ اس حقیقت کو سمجھ لینا مستقبل میں اس کی کامیابی کے لیے سیڑھی کا کام دے گا۔

پیغمبر اکرمؐ، مشرکوں اور بت پرستوں کے خلاف جنگ کرنے سے پہلے دشمن کی طاقت کا اندازہ لگاتے تھے۔ جنگ سے پہلے معلومات اکٹھی کرتے تھے (جو کبھی تلخ اور ناگوار بھی ہوتی تھیں) آپؐ کبھی دشمن کی طاقت کو نظر انداز کر دیے جانے کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ ہرگز خود کو یا مسلمان افسروں کو دھوکا نہیں دیتے تھے کہ ہم ایک ہی حملے میں دشمن کو پسپا کر دیں گے۔ یا سمندر میں ڈال دیں گے۔

جنگِ "بدر" میں مسلمان جاسوسوں نے قریش کے سپاہی کو "بدر" کے کنویں پر گرفتار کیا اور پیغمبرؐ کی خدمت میں اسے لے آئے۔ ابھی تک دشمن کی تعداد کا علم نہیں ہوا تھا۔

پیغمبرؐ نے اس سے پوچھا کہ:

"یہاں قریش روزانہ کتنے اونٹوں کو نحر کرتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا کہ:

"کبھی نو اور کبھی دس اونٹ نحر کرتے ہیں۔"

تو پیغمبرؐ نے فرمایا کہ:

"دشمن کی تعداد نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہے"

چھ جون ۱۹۶۷ء کو عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ، عربوں کی شکست پر ختم ہوئی۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ شکست کے ایک تلخ حقیقت ہونے کی بنا پر اس کے سبب کا بہت کم اعتراف کیا گیا۔ اور وہ سبب یہ تھا کہ عرب

ممالک کے سربراہوں نے دشمن اور اس کا ساتھ دینے والے جو میدان جنگ میں تھے یا پیچھے سے پشت پناہی کر رہے تھے۔ ان کی طاقت کا درست اندازہ نہیں لگایا تھا۔ صحیح اندازہ لگانے کی بجائے وہ بہادری دلانے اور جنگی نغمے چھیڑنے میں لگے رہے۔

اگر وہ حقیقت کا اندازہ لگا کر جنگ کرتے تو ہرگز اتنی فاش شکست سے دوچار نہ ہونا پڑتا جس کی مثال انسانی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔

یقیناً شک، یقین کا زینہ ہے۔ جب تک انسان کو کسی موضوع پر تردد پیدا نہ ہو اس وقت تک تحقیق کی فکر نہیں ہوتی۔

اسی طرح اعتراض اور تنقید بھی کمال تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے کامیاب شخص وہی ہے جو لوگوں کی تنقید غور سے سنتا ہے۔ بے لوث اور اصلاح کی غرض سے جو تنقید ہوتی ہے وہ اس کا جائزہ لیتا ہے کیونکہ دوسروں کے افکار کے آئینے میں انسان یا اس کے کام کے عیبوں کا واضح عکس نظر آتا ہے ؎

جمشید ساخت جام جہاں بین از آں سبب
کاگہ نبود از اینکہ جہان، جام خود نما ست

(جمشید نے جام جہاں نما اس سبب سے بنایا کہ وہ اس بات سے آگاہ نہیں تھا کہ دنیا خود اپنے آپ کو دکھانے والا جام ہے)

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"اَحَبَّ اِخْوَانِی مَنْ اَهْدٰی اِلَیَّ

عُیُوْبِیْ۔" ؎

میرے بھائیوں میں مجھے سب سے زیادہ وہی پسند ہے
جو میرے عیوب کو ایک تحفہ کے طور پر مجھے دے اور مجھے
میرے عیب بتائے۔

ہمارے ان عظیم رہنما کی نظر میں بہترین تحفہ یہی ہے کہ لوگوں کی کوتاہیوں کو صحیح انداز سے ان کے سامنے پیش کیا جائے۔

آج کی آزاد دنیا میں تنقید، زندگی کی اساس ہے۔ یورپ کی دنیا ماہر افراد کو بلاتی ہے۔ حکومت کے اور دیگر قومی اداروں کو ان کے اختیار میں دے دیتی ہے تاکہ وہ حالات کا جائزہ لیں اور تنقید کریں۔

جو شخص تنقید سن کر برا مانتا ہے۔ حقیقت جیسی ہے اس کو ویسی دیکھنا نہیں چاہتا۔ اپنے حالات کے آئینے یعنی اپنے بارے میں لوگوں کے خیالات کو دیکھنا اسے سخت ناگوار گزرتا ہے تو اس سے کہنا چاہیے کہ :

خود شکن، آئینہ شکستن خطا است
(اپنے آپ کو توڑ دے۔ آئینہ توڑ دینا خطا ہے)

؎ "وسائل الشیعہ" حصہ امر بالمعروف

لچک دار رویّہ

لچکدار ہونا اور ابن الوقت ہونا واضح فرق رکھتا ہے۔ ابن الوقت اور چاپلوس آدمی کا کوئی خاص ہدف نہیں ہوتا۔ وہ کسی صحیح اصول کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ جس طرح بھی ہو اپنے چہرے پر مختلف ماسک لگائے زندگی کے اسٹیج پر ظاہر ہوتا ہے وہ اپنے ذاتی فائدے اور اپنی نفسانی خواہشات کی خاطر تمام اصولوں کو پامال کر دیتا ہے۔

لیکن لچک رکھنے والا شخص جہاں تک اس کے اصولوں اور اہداف کو نقصان نہیں پہنچتا، وہاں تک وہ اپنے اندر لچک پیدا کر لیتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ حتیٰ دشمن کے ساتھ بھی سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے اصولوں کی حفاظت کے لیے اپنے بہت سے فائدوں کو ہاتھ سے جانے دیتا ہے اور اپنی مرضی کی بجائے لوگوں کی خواہشوں کو مقدم کر دیتا ہے۔

دنیا کے بدلتے ہوئے حالات، طوفان کی طرح خوفناک اور جڑ سے اکھاڑ دینے والے ہوتے ہیں۔ طوفان ایک جگہ سے شروع ہوتا ہے اور درختوں

پر حملہ کر دیتا ہے۔ سرسبز درخت ایک خاص لچک پیدا کر کے طوفان کو آگے بڑھا دیتے ہیں اور پھر فوراً ہی اپنی جگہ واپس آجاتے ہیں۔ اپنے جھکے ہوئے قد کو دوبارہ سیدھا کر لیتے ہیں۔ لیکن خشک اور سخت درخت، شدید ہواؤں کے آگے جوں کے توں کھڑے رہتے ہیں۔ خشکی اور سختی کی وجہ سے ان میں لچک نہیں ہوتی۔ اس کے نتیجے میں وہ جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔

حکومت کا سربراہ جس کے ذمہ تمام اہم امور ہوتے ہیں۔ ادارے کا مینجنگ ڈائریکٹر جسے سینکڑوں افراد سے سروکار ہوتا ہے۔ ایک تاجر جس کا قسم قسم کے گاہکوں سے واسطہ پڑتا ہے اگر ایسے لوگ اپنے وقتی فائدے کے لیے اصولوں کی پروانہ کریں تو ابن الوقت ہیں لیکن اگر یہی لوگ اپنے اور ادارے کے اصولوں کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنی شدت میں کمی کر دیں اور مربوط افراد کے مطالبوں کا مثبت جواب دیں اور تھوڑے بہت مادی نقصان اور رنج کو برداشت کر کے ان افراد کا دل موہ لیں تو ایسے لوگوں کو ہم لچک کی صلاحیت رکھنے والا شمار کریں گے۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لچک کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ:

"مَثَلُ الْمُؤْمِنِ مَثَلُ السُّنْبُلَةِ
تَحَرَّكُهَا الرِّيحُ فَتَقُومُ مَرَّةً
وَتَقَعُ أُخْرَىٰ، وَمَثَلُ الْكَافِرِ
مَثَلُ الْأَرْزَةِ لَا تَزَالُ قَائِمَةً
حَتَّىٰ تَنْقَلِعَ۔"

حالات کے طوفان کے سامنے مومن سنبل کے لچکدار پودے کی طرح ہے، جب طوفان کا جھکڑ چلتا ہے تو وہ لچک پیدا کر لیتا ہے اور سختی سے کھڑا نہیں رہتا۔ لیکن کافر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ وہ خشک درخت کی طرح سے ٹس سے مس نہیں ہونا چاہتا جس کے نتیجے میں وہ اکھڑ جاتا ہے۔" [1]

جزوی اور معمولی کاموں میں سختی ایسے شخص کے لیے جو لوگوں کے مختلف طبقوں کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ پس ماندگی اور بدنامی کا سبب ہے ایسی سختی لوگوں کے دلوں میں بیزاری پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں کوئی شخص بڑے مقامات اور اعلیٰ مقاصد کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی لیے یہ بات بہت صراحت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ کوئی شخص معاشرے میں اسی صورت میں اپنا مقام پیدا کر سکتا ہے جبکہ اس میں مناسب لچک موجود ہو۔

اگر آپ صلح حدیبیہ کا متن ملاحظہ کریں تو آپ کو پیغمبر اکرمؐ کی لچک دیکھ کر تعجب ہوگا۔ ۶ھ ہجری میں قریش کی بت پرست قوم کے ساتھ آپؐ نے جو معاہدہ کیا اس پر بعض بے خبروں اور نادانوں نے اعتراض بھی کیا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ثابت ہو گیا کہ آپؐ کی یہ لچک آئندہ کی کامیابیوں کے لیے ضروری تھی۔

اسلام کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ قریش کی بت پرست قوم تھی

---

[1] "تفسیر روح البیان" سورہ منافقون کی تفسیر میں۔

انھوں نے اپنے مسلسل حملوں کے ذریعے پیغمبر اکرمؐ سے ہر قسم کی آزادی چھین لی تھی۔ اگر یہ رکاوٹ راستے میں نہ ہوتی تو پیغمبرؐ کی دعوت اتنی پُر اثر تھی کہ تھوڑی سی مدت میں آپؐ مبلغوں کو بھیج کر اور دعوتِ قرآن ہر جگہ پہنچا کر عرب کے جزیرہ نما کو توحید کے پرچم تلے لا سکتے تھے۔ لیکن ان دشمنوں نے براہ راست یا بالواسطہ مقابلہ کر کے پیغمبر اکرمؐ سے تبلیغ کی فرصت چھین لی تھی۔

پیغمبرؐ کا اعلیٰ ہدف اور مقصد یہ تھا کہ آپؐ کو تبلیغ رسالت کی آزادی ملے۔ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے آپؐ نے قریش سے معاہدہ کیا اور اس میں آپؐ کی طرف سے عجیب لچک کا اظہار ہوتا ہے۔

ہم اس کی طرف اپنے مطلب کو واضح کرنے کے لیے کچھ اشارہ کرتے ہیں :

① ——— صلح نامہ لکھنے کے لیے پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو مقرر کیا تھا۔ انھوں نے پہلے صفحہ پر لکھا :

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تو قریش کے نمائندے نے کہا کہ ہم رحمان اور رحیم کے لفظوں سے آشنائی نہیں رکھتے۔ عرب کی رسم کے مطابق بِسْمِكَ اللّٰهُمَّ لکھا جانا چاہیے۔ پیغمبرؐ نے یہ بات قبول کر لی۔ اور حضرت علیؑ نے بِسْمِكَ اللّٰهُمَّ لکھ دیا۔

اس کے بعد پیغمبرؐ کے مطابق حضرت علیؑ نے لکھا :

" یہ ایک صلح کا معاہدہ ہے جسے محمد رسولِ خدا نے قریش کے نمائندے کے ساتھ برقرار کیا... "

فوراً قریش کے نمائندے نے کہا کہ ہم محمدؐ کو رسولِ خدا

تسلیم نہیں کرتے۔ اگر تسلیم کرتے تو اس سے جنگ نہیں کرتے۔ پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ وہ "رسولِ خدا" کا لفظ مٹا دیں۔

(۲) ——— اسی معاہدہ کی ایک شق یہ تھی کہ اگر کوئی مشرک مکہ سے مرکز اسلام مدینہ بھاگ کر آجائے تو اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اسے قریش کے ذمہ دار افراد کے حوالے کرے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان مدینہ سے نکل کر مکہ میں پناہ حاصل کرے تو قریش کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اسے مسلمانوں کے حوالے کریں۔ پیغمبر اکرمؐ نے یہ بات بھی اس لیے قبول کر لی کہ آپؐ کو اور آپؐ کے پیرو مسلمانوں کو قریش کی جانب سے کچھ بے فکری نصیب ہو۔ اور تبلیغ کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔ آپؐ نے قریش کو جو توفیقیں دیں ان کی نسبت آپؐ کو جو تبلیغ کے سلسلے میں فوائد حاصل ہوئے وہ زیادہ اہم تھے۔

ہمارے کاموں کا ایک عیب یہ ہے کہ ہم اپنے فائدے کے سلسلے میں جب جمع تفریق کرتے ہیں تو اعتدال کو بھول جاتے ہیں۔ اگر ہم کسی قوم سے قطع تعلق کیے ہوئے ہیں تو ہمیشہ تعلق قطع ہی رکھتے ہیں۔ ہرگز یہ فکر نہیں کرتے کہ خاص شرائط کے ساتھ روابط استوار کیے جا سکتے ہیں۔ گویا ہم لچک کو اپنے لیے ذلت اور شکست کی علامت سمجھتے ہیں، حالانکہ عقل اور شرع کہتی ہے کہ جہاں تک اصل مقصد کو نقصان نہ پہنچے وہاں تک لچک اختیار کر لینا۔ کامیابی کا ایک اصول ہے۔

صحیح طریقہ

دنیا کا ایک انتہائی بڑا ماہر اقتصادیات کہتا ہے کہ:

"اقتصادی ادارے اور مختلف چیزیں تیار کرنے والے کارخانے اپنی حالت پر برقرار رہنے کی وجہ سے زوال پذیر ہو جاتے ہیں ——— !"

دانشوروں کا عقیدہ ہے کہ ایک ہی حالت پر برقرار رہنا ایک قسم کا زوال ہے۔ لیکن کیا یہ قانون صرف کارخانوں کے لیے ہے؟

یا یہ کہ یہ ایک عمومی قانون ہے اور ہر صنف اور ہر شعبہ کے تمام طبقوں کے لیے ہے ——— ؟!

اس سلسلہ میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کہتے ہیں کہ:

"جس کے مسلسل دو دن اس طرح گزریں کہ مادی

اور روحانی لحاظ سے دوسرا دن پہلے دن جیسا ہی
ہو تو اس نے زندگی میں نقصان اٹھایا ہے۔"

انسان کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی عمر ہے۔ یہ قیمتی سرمایہ بتدریج خرچ ہوتا ہے۔ اگر اس کا عوض اس سرمائے کی شان کے مطابق نہ ہو تو گویا ہم نے اپنا سرمایہ ہاتھ سے کھو دیا اور اس کے عوض میں کچھ خرید نہیں پائے۔

اصولی طور پر جدت پسندی، انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ انسان مسلسل ایک جیسا کام کرکے اکتا جاتا ہے۔ لذیذ ترین غذائیں بھی اگر روز کھانے کو ملیں تو ان کی لذت ختم ہو جاتی ہے۔

دکاندار اور بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے مالکان، یکسانیت کو ختم کرنے کے لیے ہر سال اپنی دکان کی ترتیب بدل دیا کرتے ہیں۔ اگرچہ کہ دونوں انداز کی سیٹنگ سے فائدہ ایک ہی طرح کا حاصل ہو۔

کثیر الاشاعت اخبار جو روز لوگوں کی نظروں سے گزرتے ہیں یکسانیت کو ختم کرنے کے لیے ہر روز یا ہر ہفتہ چھپائی کے طرز اور رنگ وغیرہ میں تبدیلی لاتے رہتے ہیں تاکہ برا معلوم نہ ہو۔

اسی طرح بڑے ہوٹلوں میں ڈائننگ ہال کی ڈیکوریشن ہر سال تبدیل کی جاتی ہے تاکہ آنکھوں کو بھلا لگے اور اکتاہٹ نہ ہو۔

لیکن کیا ہر قسم کی جدت پسندی اور تبدیلی ترقی کی علامت ہے؟!

خواہ اس طرح بہتر چیز بدتر میں تبدیل ہو جائے۔

ہرگز نہیں!

جہاں دنیا کے بڑے ماہرینِ اقتصادیات، یکسانیت کو زوال کی ایک

قسم سمجھتے ہیں وہاں بہتر چیز کو بدتر سے بدل لینے کو خودکشی شمار کرتے ہیں۔

اس اعتبار سے جو بھی تبدیلی ہوا سے ٹھیک طرح سے اور پہلے سے بہتر ہونا چاہیے۔ اگر ہم ایک اصلاح کریں تو صرف ظاہری تبدیلی کو نہ دیکھیں۔ بلکہ اصل کام کی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے مطابق تبدیلی لائیں۔

مشرق کے بہت سے کارخانوں میں بڑا عیب یہی ہے کہ اگر لوگ ایک دفعہ ان کی تیار کی ہوئی چیزوں کو پسند کریں تو وہ کبھی بھی ان چیزوں کی شکل و صورت اور ان کے میٹریل میں تبدیلی نہیں لاتے۔ اور اگر کبھی ایسا کرنا بھی چاہیں تو ٹھیک طرح سے نہیں کرتے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، نظم وضبط اور ٹھیک طریقے سے کام انجام دینے کو پسند فرماتے تھے۔

جب ایک فوجی افسر "سعد ابن معاذ" کا جنازہ اٹھا اور انھیں قبر میں اتار دیا گیا تو آپؐ نے دیکھا کہ اصحاب مٹی ڈالتے وقت بے ترتیبی سے مٹی قبر میں ڈال رہے ہیں۔ آپؐ یہ دیکھ کر ناراض ہوئے۔ اس فوجی افسر کی قبر کے کنارے بیٹھ گئے۔ مٹی کو اپنے ہاتھوں سے ہموار کیا۔ پھر اصحاب سے فرمایا:

"میں جانتا ہوں کہ یہ قبر جلد پرانی ہو
جائے گی لیکن خدا ایسے بندے کو
پسند کرتا ہے جو کام کے موقع پر اُسے
درست طریقہ سے اور مکمل طور پر انجام دے۔"[1]

---

[1] سفینۃ البحار۔ جلد ۲ صفحہ ۲۷۸

آپؐ جانتے تھے کہ یہ بدنظمی زندگی کے تمام شعبوں میں سرایت کرسکتی ہے۔ آپؐ اس بات پر راضی نہیں ہوتے تھے کہ ایسا چھوٹا کام بھی بے ترتیبی سے انجام پائے جس کا اثر چند دن میں ختم ہو جانے والا ہو۔

جو جوان چاہتا ہو کہ ہر چھوٹے بڑے کام میں اس کی کوشش کو سراہا جائے۔ اور اس کی کامیابی کام کے سلسلہ میں دائمی رہے۔ تو اسے چاہیئے کہ وہ آج کے کام کو گزشتہ کل کے کام کی نسبت بہتر طریقے سے انجام دے۔

حصّہ دوّم

کامیابی کے موہوم اسباب

غیر متوقع کامیابی

کائنات کا نظام، علت اور معلول کے قانون پر برقرار ہے۔ ایک معمولی سی حرکت بھی بے علت اور بغیر کسی سبب کے نہیں ہے۔

سمندروں کا تلاطم ـــــ پتوں کا درختوں سے گرنا ـــــ برفباری، برسات ـــــ ہاتھ کی لکیروں کا مختلف ہونا ـــــ لوگوں کی شکل وصورت میں فرق ہونا ـــــ قوموں کی ترقی اور زوال ـــــ معاشروں کی خوبیاں اور خامیاں، غرض دنیا کی ہر چیز کے لیے کسی نہ کسی علت اور سبب کا موجود ہونا یقینی ہے۔ کبھی وہ سبب ہمارے لیے واضح ہوتا ہے اور کبھی ہم سے پوشیدہ ہوتا ہے۔

اس لحاظ سے "چانس" کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ دنیا کے عمومی فلسفہ سے اس کے وجود کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ چانس پر اعتماد کرنا درحقیقت محض ایک خیالی اور حقیقت سے دور چیز پر اعتماد کرنا ہے۔ نادان اور ناواقف

افراد، خوش قسمتی یا بد قسمتی کو اسی بے ہودہ اور خیالی چیز سے وابستہ سمجھتے ہیں۔
"قسمت"، "اتفاق"، "چانس" اور "اقبال" درحقیقت خیالی باتیں ہیں۔ یہ باتیں ایسے ہی لوگوں کے ذہن میں آتی ہیں جو مختلف باتوں کے اسباب سے واقف نہیں ہو پاتے۔ اس لیے وہ اپنے ملامت کرنے والے ضمیر کو راضی کرنے کے لیے نادیدہ اور بے ہودہ اسباب کے قائل ہو جاتے ہیں۔

اگر ہمیں "چانس" پر اعتقاد رکھنا ہی ٹھہرا تو ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ کام، کوشش، جہد و جہد اور سرگرمی ہی چانس اور خوش قسمتی کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اور یہ نادیدہ سبب (چانس) سرگرمی اور کوشش میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

سستی اور کاہلی کے لیے اور ذہن اور ذہنیت کو خراب کرنے کے لیے قسمت پر اعتقاد ایک وسیلہ ہے۔ ہارنے والوں کے نفس کی تسکین کے لیے یہ ایک خواب آور دوا ہے۔

دوسرے الفاظ میں قسمت پر اعتقاد، گنہگاروں اور خطاکاروں کے ضمیر کو ڈھانپ دینے کے لیے ایک سرپوش ہے۔

اولمپک کے مقابلوں میں جو کھلاڑی ہار جاتا ہے اور کامیابی کا افتخار اور میڈل اس کے حریف کو مل جاتا ہے تو وہ بگڑے ہوئے چہرے اور پسینے میں تر پیشانی کے ساتھ گراؤنڈ سے باہر آتا ہے اور اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کی تلافی کے لیے اپنے دوستوں سے کہتا ہے کہ:

"میرے حریف کی قسمت اچھی تھی جبھی اسے کامیابی
نصیب ہوئی اور میری قسمت اس دفعہ اچھی نہیں تھی

جبھی میں ہار گیا۔"

افسوس کی بات یہ ہے کہ آئندہ مقابلوں میں شکست سے بچنے کے لیے وہ اپنی شکست کے حقیقی سبب کو دریافت نہیں کرتا بلکہ ایسے خیالی سبب کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے جس کا علم اور فلسفہ کی رو سے کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس طریقے سے خود کو شکست کا ذمہ دار نہ ٹھہرائے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایک غلط رواج عام ہے اور وہ یہ کہ ہم گھریلو زندگی میں اور تعلیمی اور کاروباری سلسلے میں قسمت کو زندگی کی بنیاد قرار دے دیتے ہیں۔ ماں باپ، اساتذہ اور تاجر حضرات ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ لوگ خود بخود کامیابی اور شکست کا سبب چانس اور قسمت کو قرار دیتے ہیں بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں اس غلط رواج کے بُرے اثرات ہمیشہ کے لیے ذہنوں میں گھر کر لیتے ہیں۔

ہماری عظیم آسمانی کتاب "قرآن مجید" میں موجود ایک چھوٹی سی لیکن مفہوم کے اعتبار سے بہت بڑی آیت نے ایسی خیالی باتوں پر خطِ تنسیخ پھیر دیا ہے۔ اور وہ آیت یہ ہے کہ:

"وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى"

(انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے)

لاٹری، جوئے اور طرح طرح کی قسمت آزمائی کی چیزوں کی سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ وہ ہمارے معاشرے کے جوانوں کو خیالی باتوں کا معتقد بنا دیتی ہیں اور اس طرح کام اور کوشش کرنے کا جذبہ ان میں کم ہو جاتا ہے

جوان اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی بجائے مقام، شخصیت اور دولت حاصل کرنے کے لیے قسمت جیسی خیالی باتوں کے پیچھے جانے لگتے ہیں۔

کامیاب خواتین و حضرات وہی ہیں جن کی زندگی کی لغت میں قسمت، فال، ستارہ، ہاتھ کی لکیر اور چانس جیسے الفاظ نہیں پائے جاتے۔ کیونکہ یہ چیزیں لوہے کی ایسی زنجیریں ہیں جو انسان کے ہاتھ پاؤں کو باندھ کر رکھ دیتی ہیں۔

جو جوان ترقی اور کمال حاصل کرنا چاہتا ہے، اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنا چاہتا ہے اس کو جان لینا چاہیے کہ کسی طالب علم، موجد، فوجی افسر یا سیاستدان کی کامیابی کی اصل وجہ یہی ہوتی ہے کہ اس نے زندگی کی حقیقت کو محسوس کر لیا ہے اور کامیابی کے اصل اسباب کو اپنایا ہے جس میں سرفہرست "کام" ــــــ "کوشش" "ثابت قدمی" ــــــ اور ــــــ "نظم وضبط" ہیں۔ اس کو یہ جان لینا چاہیے کہ کوئی ستارہ، جادو یا چانس کامیابی کا سبب نہیں ہوا کرتا۔

ہمارے ایک دوست حال ہی میں مغربی جرمنی سے لوٹے ہیں۔ وہ جرمن قوم کی ترقی کے بارے میں کہتے ہیں:

> "اس قوم نے مختصر سے عرصہ میں چند چیزوں کو یادگار کے طور پر باقی رکھنے کے علاوہ جنگ کے بقیہ تمام آثار مٹا دیے۔ اب یہ ملک گویا وہ ملک نہیں رہا جس میں کئی سال پہلے اتحادیوں کے بم تباہی مچایا کرتے تھے۔"

اس قوم کی زندہ روح اور توانا ذہنیت ہی کامیابی کا سبب بنی۔ وہ لوگ چانس اور قسمت پر تکیہ نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں پر

بھروسہ کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر قسمت کا کوئی وجود ہے تو وہ ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے اندر پوشیدہ ہے۔

قسمت، فال، ستارہ وغیرہ

ایک دانشور کا قول ہے کہ :

"جس قوم نے حقیقتوں کو دریافت نہیں کیا ہو، وہی خیالی اور بے ہودہ باتوں کی پناہ حاصل کرتی ہے۔"

ایک تباہ حال تاجر اپنی حالت کی بہتری کے خواب دیکھ کر خوش ہو لیتا ہے ایک شکست کھائی ہوئی قوم، فال اور ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر اپنی فتح کو یقینی سمجھنے لگتی ہے۔ بیمار عورتیں ماہر ڈاکٹر سے رجوع کرنے کی بجائے جادو ٹونے کے چکر میں پڑ جاتی ہیں۔

توہم پرست اور نادان والدین اپنی اولاد کے ذہنوں کو مہمل اور بیہودہ باتوں سے بھر دیتے ہیں۔ شادی کے بعد آنے والی بدھ کو اور عید نوروز کے تیرھون بعد کی جانے والی رسموں کو کامیابی کا زینہ سمجھتے ہیں۔ نوروز کے بعد تیرھویں دن وہ اپنی اولاد کو جنگل میں لے جاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ وہ لمبی گھاس میں گرہیں لگائیں تاکہ ان کی حاجتیں پوری ہوں اور ان کی روٹھی ہوئی قسمت لوٹ کر آجائے۔

والدین اپنی اولاد سے کہتے ہیں کہ اگر سات قسم کے کھانوں سے سجے ہوئے دسترخوان پر بیٹھو گے اور ایک لال بیگ اپنے ہاتھ میں پکڑ لو گے تو یقیناً دولتمند بن جاؤ گے۔ [1]

---

[1] یہ توہمات ایرانی معاشرے کی ہیں، ہمارا معاشرہ بھی اسی جیسی توہمات سے بھرا ہوا ہے۔ (مدیر)

ہمارے عظیم پیغمبرؐ نے اپنی زندگی کے ہر دور میں اس قسم کی تمام خرافات کی سخت مخالفت کی ہے۔

ایک دن آپؐ کی دائی نے اپنے بیٹوں کے ساتھ آپؐ کو سیر کے لیے جنگل کی طرف روانہ کیا اور آپ کی حفاظت کے لیے ایک سبز یمنی پتھر کو دھاگے سے باندھا اور آپؐ کی گردن میں لٹکا دیا۔ آپؐ نے اپنی دائی کے سامنے ہی پتھر کو اپنی گردن سے نکالا اور فرمایا:

"ماں! یہ کیا وہمی باتیں ہیں۔ میری حفاظت کرنے والا کوئی اور (خدا) ہے۔"

کبھی ایک ڈرائیور، گاڑی کے بریک اور ٹائر وغیرہ کا خیال رکھنے کی بجائے اور ناکارہ چیزوں کو نئی چیزوں سے بدلنے کی بجائے توہمات کی پناہ لیتا ہے۔ گھوڑے کی ایک نعل گاڑی کے پیچھے ٹھونک لیتا ہے کہ شاید یہ نعل گاڑی کو محفوظ رکھے۔

ایک مسلح ڈاکو کو دس سال قید کی سزا ہو جاتی ہے۔ جب وہ جیل کے اندر قدم رکھتا ہے تو جیل کی دیواروں کو اس قسم کے اشعار سے سیاہ کرتا ہے۔ ؎

کوکب بختِ مرا ہیچ منجم نشناخت
یارب از مادر گیتی بہ چہ طالع زادم
(میری قسمت کے ستارے کو کسی نجومی نے نہیں پہچانا۔ یارب!
میں دنیا میں کیا قسمت لے کر پیدا ہوا ہوں؟)

وہ اتنا غافل اور خود اپنے الفاظ میں "بدقسمت" ہے کہ اب جبکہ جیل کی کال کوٹھری کی اذیتیں سہہ رہا ہے تو بھی حقیقت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے تیار

نہیں ہے۔ وہ اپنے ملامت کرنے والے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے اپنا گناہ ستاروں اور قسمت کی گردن پر ڈالتا ہے۔ وہ خود سے یہ نہیں کہتا کہ میں نے اپنے اختیار سے اسلحہ استعمال کیا اور ملک کی امنیت کو خطرے میں ڈال دیا۔ کاروباری مراکز اور دکانیں میری وجہ سے بند ہو گئیں۔ میری سزا یہی ہے۔

اے کاش کہ وہ اس شعر کی بجائے ناصر خسرو کے یہ اشعار دیوار پر لکھتا :

نکوهش مکن چرخ نیلوفری را
برون کن ز سر باد خیره سری را

تو خود چون کنی اختر خویش را بد
مدار از فلک چشم نیک اختری را

بسوزند چوب درختان بی بر
سزا خود همیں است مر بی بری را

درخت تو گر بار دانش بگیرد
بزیر آورد چرخ نیلوفری را

(نیلے آسمان کو برا بھلا نہ کہہ۔ اپنے سر سے لاپرواہی کی ہوا نکال دے، اگر تو خود اپنی قسمت کو برا بنائے تو آسمان سے امید نہ رکھ کہ وہ تجھے خوش قسمت بنا دے گا۔ بغیر پتوں والے درختوں کی لکڑی جلا دی جاتی ہے زندگی کے درخت کی دیکھ بھال نہ کرنے کی یہی سزا ہے

اگر تیری زندگی کے درخت پر علم و فکر کے پھل لگیں تو ایسا
درخت آسمان کو بھی نیچے اتار سکتا ہے۔)

کامیاب شخص وہی ہے جو بلند مقاصد کی راہ میں قدم آگے بڑھائے۔
اور ہر قسم کے توہمات اور بے بنیاد خیالوں سے پرہیز کرے۔
پیغمبر اکرمؐ خاص طور پر کوشش کرتے تھے کہ لوگوں کو توہمات کی قید سے رہائی دلوائیں۔ اگر کوئی بے بنیاد خیال آپ کے حق میں بھی جاتا تو بھی آپؐ لوگوں کو بتاتے کہ:

"ایسا عقیدہ بے بنیاد ہے۔"

مثلاً پیغمبر اکرمؐ کے بیٹے "ابراہیم" کا انتقال ہو گیا۔ اس دن سورج کو گرہن لگ گیا۔ اس زمانے کے وہمی لوگ حضورؐ کی خدمت میں پہنچے اور کہنے لگے کہ:

"آپؐ پر جو آج مصیبت آئی وہ اتنی بڑی ہے کہ
سورج بھی اس کا غم منا رہا ہے۔ آج آپؐ کے بیٹے
کی وفات پر اسے گرہن لگا ہوا ہے۔"

آپؐ نے جواب میں یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

"لوگو! چاند سورج کسی کے مرنے کا غم نہیں مناتے
بلکہ چاند گرہن اور سورج گرہن خدا کی نشانیوں میں
سے ہیں۔" (گرہن کی ایک خاص وجہ ہے اسے میرے
بیٹے کی وفات سے منسوب نہیں کرنا چاہیے۔)

توہمات پرست مغرب زدہ لوگ

بعض مغرب زدہ لوگ اتنے توہم پرست ہوتے ہیں کہ "۱۳" نمبر کے کمرے

سے ڈرتے ہیں۔ اس لیے ہوٹل والے تیرہ نمبر کے کمرے پر "۱ + ۱۲" لکھتے ہیں یا اسے چودہ نمبر کا کمرہ بنا دیتے ہیں۔ اور تیرہ کو بالکل حذف کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اقوام متحدہ کی عمارت میں لفٹ بارہویں فلور کے بعد چودھویں فلور پر پہنچتی ہے تیرھواں فلور بالکل نہیں ہے۔ درحقیقت تیرھواں فلور وہی ہے جسے چودھواں فلور کہا جاتا ہے۔

یہ لوگ یہ غور نہیں کرتے یا غور کرنا ہی نہیں چاہتے کہ اگر تیرھواں فلور خطرناک اور منحوس ہے تو نام بدلنے سے اس کی حقیقت تو نہیں بدل جاتی۔

شیخ سعدی اپنے اشعار میں ایک قصہ پیش کرتے ہیں کہ :

یکی روستائی سقط شد خرش
علم کرد بر تاک بستان سرش

جہاں دیدہ پیری براو بر گذشت
ہمی گفت خنداں بہ ناطور دشت

مپندار جان پدر، کین حمار
کند دفع چشم بد از کشتزار

کہ این دفع چوب از سر و گوش خویش
نتانست تا بینوا مرد ریش!

کنون دفع چشم بد از کشتزار
چگونہ تواند، توقع مدار!

(ایک دیہاتی کا گدھا مر گیا۔ اس نے گدھے کا سر کاٹ کر انگور کی بیل پر لٹکا دیا۔ ایک جہاندیدہ بزرگ وہاں سے گزرے تو انھوں نے ہنستے ہوئے اس دیہاتی باغبان سے کہا کہ "اے میری جان! تو یہ نہ سمجھ کہ یہ گدھا باغ کو نظر بد لگنے سے بچائے گا۔ یہ گدھا اپنی زندگی میں ایک کمزور شخص کے ہاتھ سے سر پہ پڑنے والی لاٹھی کو نہیں روک سکتا تھا تو اب مرنے کے بعد باغ کو بُری نظر سے کس طرح بچا سکے گا۔ تو اس کی توقع نہ رکھ!)

اسی تماشہ کا ایک شخص قسمت کا اتنا معتقد تھا کہ وہ کہتا تھا کہ:

"میں بُری قسمت لے کر دنیا میں آیا ہوں۔ میری
قسمت اتنی بُری ہے کہ اگر میں ٹوپیاں سینے والا ہوتا
تو لوگ دنیا میں بغیر سر کے پیدا ہونے لگتے۔"

اس قسم کی وہمی باتیں اگر کسی قوم کے اندر اور خصوصاً اس کے جوانوں میں رائج ہو جائیں تو اسے قوم کے زوال کا ایک سبب سمجھنا چاہیے۔

آسمان کی شکایت!

بعض لوگوں کا معمول ہے کہ وہ آسمان سے شاکی رہتے ہیں اور بعض بُرے حالات کی ذمہ داری آسمان کی گردن پر لاد دیتے ہیں۔ حتیٰ بعض دانشوروں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنی کتابوں کے دیباچوں میں آسمان کے ستم پر فریاد کرتے ہیں۔

لیکن اگر ہم حقیقتاً جائزہ لیں تو آسمان تو انسان کا خدمت گزار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسے انسان کے لیے بنایا ہے اور اس کے قبضے میں دے دیا ہے۔ مثلاً: سورج اپنی سنہری شعاعوں کے ذریعے جانوروں کی پرورش کرتا ہے، چاند فضا کو نور اور تازگی بخشتا ہے۔ اس بنا پر انسان کے خدمت گزاروں کو ظالم اور ستمگر نہیں کہنا چاہیے۔ چاند، سورج، ستاروں اور آسمان میں نحوست نہیں ہوتی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ خداوند کریم نے قرآن مجید میں ان چیزوں کی قسم کھائی ہے اور ہمیں ان چیزوں کی عظمت کی طرف متوجہ کیا ہے۔

اس نکتہ پر توجہ دینی چاہیے کہ اگر دانشوروں اور ادیبوں نے آسمان کا گلہ کیا بھی ہے تو اس سے مراد یقیناً آسمان کے نیچے رہنے والے افراد ہیں۔ ورنہ ستاروں اور آسمان و زمین کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔

اتفاقات کا انتظار

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کبھی اتفاقات انسان کے کام میں موجود مشکل کو آسان کر دیتے ہیں۔ اور کسی شخص کی زندگی ایسے شیریں اتفاقات سے خالی نہیں۔ تاریخ کے صفحات میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ہم ان میں سے کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں۔

(۱) ——— عماد الدولہ دیلمی نے اصفہان اور فارس پر قبضہ کر لیا۔ اس نے اصفہان شہر کے سابق حاکم کو شہر سے باہر نکال دیا۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس کا اور اس کے فوجیوں کا سرمایہ ختم ہو گیا۔ اس کو خدشہ ہوا کہ کہیں اس کے فوجی عوام کے مال کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں اور اس کے نتیجے میں کہیں ایسا نہ ہو کہ عوام ناراض ہو جائیں۔ اسی کشمکش کے عالم میں اس کی نظر چھت پر پڑی۔ اس نے دیکھا کہ ایک سانپ نے سوراخ سے

سر باہر نکالا اور پھر دوبارہ اندر چلا گیا۔ سانپ نے اس طرح چند دفعہ کیا۔ اس نے حکم دیا کہ عمارت کی چھت کو توڑا جائے اور دیکھا جائے کہ سانپ کا راستہ کہاں تک جاتا ہے۔ سوراخ کے آخری سرے تک جب یہ لوگ پہنچے تو وہاں اشرفیوں سے بھرے ہوئے برتن نظر آئے جنھیں پچھلے حاکم نے ضرورت کے وقت استعمال کرنے کے لیے رکھا تھا۔ عماد الدولہ نے حکم دیا کہ یہ سب برتن نکال لیے جائیں۔ اس طرح عماد الدولہ مالی بحران کا شکار ہونے سے بچ گیا۔

(۲) ——— شاہ اسماعیل سامانی، عمر ولیث کو شکست دینے کے بعد مالی مشکلات سے دوچار ہو گیا۔ امکان تھا کہ اس کے فوجی عوام کے مال پر ہاتھ صاف کرنے لگیں گے۔ اس سے بچنے کے لیے اس نے فوجیوں کو شہر سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ فوجیوں نے راستے میں دیکھا کہ ایک کوا ان کے سر کے اوپر اُڑ رہا ہے اور اس کی چونچ میں ایک ہار ہے۔ وہ لوگ کوے کا پیچھا کرنے لگے۔ کوے نے ہار ایک کنویں میں ڈال دیا۔ چند لوگ بادشاہ کے حکم سے کنویں میں اترے۔ وہاں انھیں زر و جواہر سے بھرا ہوا ایک صندوق ملا۔ جسے عمر ولیث کے غلاموں نے اس کی گرفتاری کے وقت وہاں چھپا دیا تھا اور بعد میں وہ اسے نکال نہیں پائے تھے۔

(۳) ——— شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی، باب قناعت میں مکّا بازی

کی داستان کے ضمن میں یہ حکایت نقل کرتے ہیں کہ :
ایک شاہزادے نے انگوٹھی کا چھلا ایک اونچی جگہ پر رکھ دیا تھا تاکہ تیر انداز اس چھلے کے بیچ میں اپنے تیر پھینکنے کی کوشش کریں۔ طے یہ پایا کہ جو کوئی بھی ٹھیک نشانے پر تیر پھینکے گا اس کو بہت بڑا انعام دیا جائے گا۔ ماہر تیر انداز سب کے سب ناکام رہے۔ اسی دوران ایک اناڑی بچے نے جو تیر اندازی کے اصولوں کی شد بد بھی نہیں رکھتا تھا نشانے پر تیر پھینکا جس اتفاق سے وہ تیر چھلے کو پار کر گیا اور اس طرح یہ بچہ انعام کا حقدار ہوا۔

لیکن کیا یہ داستانیں انسان کی زندگی کا سہارا بن سکتی ہیں اور کیا انسان زندگی کی لگام اتفاقات کے ہاتھ میں دے سکتا ہے ؟!

اتفاق سے ہونے والی کامیابیوں میں اور سعی و کوشش کے بعد سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہونے والی کامیابیوں میں تناسب آٹے میں نمک سے بھی کم کا ہے اتفاق سے ہونے والی کامیابیاں بہت کم ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اتفاق کے نتیجے میں زہر سے زیادہ تلخ پھل ہاتھ آتا ہے۔ سمجھ دار افراد اور لائق لوگ کبھی بھی خلافِ توقع اتفاقات کے انتظار میں نہیں بیٹھے رہتے۔ ایسے لوگ کبھی ظاہری اسباب کو چھوڑ کر "اتفاق" کے وہم میں گرفتار نہیں ہوتے، جس کا امکان دس ہزار یا اس سے زیادہ میں ایک دفعہ ہوتا ہے۔

آپ فرض کیجیے کہ ایک شہر میں دس لاکھ افراد رہتے ہیں۔ ایک ہوائی جہاز

سونے کے دو سکّے اس شہر کے لوگوں پر گرانا چاہتا ہے تو کیا ان سکّوں کی اُمید میں کام چھوڑ کر بیٹھا جا سکتا ہے ؟!

اگر ہم ایسا کریں اور ہمارے پاس پہلے سے کچھ پیسہ نہ ہو تو ہمیں رات کو کھانے میں روٹی بھی نہیں ملے گی !!

جو قوم کام اور کوشش پر بھروسہ نہ کرے اور بین الاقوامی تبدیلیوں کا انتظار کرے کہ شاید حالات اس کے موافق ہو جائیں اور بڑے ممالک اس پر رحم کھائیں تو ایسی قوم یقیناً تباہی و بربادی سے دوچار ہوتی ہے۔

اگر کوئی طالب علم مطالعہ اور محنت کرنے کی بجائے خلاف توقع اتفاقات کے انتظار میں بیٹھ جائے کہ شاید کبھی اتفاق سے اُسے اچھے نمبر مل جائیں تو اس کا کوئی فائدہ اسے حاصل نہیں ہوگا۔

پیشوایانِ اسلام میں سے ایک نے یہ جملہ ارشاد فرمایا ہے جو دانشمندوں کی نظر میں بہت اہم ہے اور وہ یہ ہے کہ :

"مَنْ وَجَدَ مَاءً وَتُرَابًا ثُمَّ افْتَقَرَ فَأَبْعَدَهُ اللّٰهُ"

(جس قوم کے پاس زمین اور پانی میں قدرتی خزانے موجود ہوں لیکن وہ خدا کی ان عظیم نعمتوں کو استعمال نہ کرے اور فقیر ہو جائے تو خدا اسے اپنی رحمت سے دور کر دے گا۔)

دنیا کی کسی قوم نے ترقی نہیں کی اور کوئی شخص حالات سے مقابلہ میں کامیاب

نہیں ہوا، مگر یہ کہ ظاہری اور فطری اسباب سے فائدہ اٹھایا گیا ہو۔ راسخ ایمان کے ساتھ ھدف کی راہ میں قدم اٹھا ہوا اور اتفاقات کا انتظار نہ کیا گیا ہو۔

اور ایک شاعر کے بقول ہے

مرد بزرگ باید و عزمی بزرگ تر
تا حل مشکلات بہ نیروی او کنند

آزادہ گی بہ قبضہ شمشیر بستہ است
مردان، ہمیشہ تکیہ خود را بدو کنند

قانون خلقت است کہ باید شود ضعیف
ہر ملتی کہ راحتی و عیش خو کنند

(بڑے آدمی کو اپنے سے بڑا عزم کرنا چاہیئے تاکہ وہ اس عزم کی طاقت سے مشکلات کو حل کرے۔ آزادی تلوار کے قبضے سے وابستہ ہے، بہادر لوگ ہمیشہ اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ یہ ایک فطری قانون ہے، جو قوم عیش و آرام کی عادی بن جائے، کمزوری اس کا نصیب ہوگی)

ممکن ہے کہ کوئی شخص یا کوئی قوم اتفاق کے مرہون منت کچھ کامیابیاں حاصل کرے لیکن اتفاق سے ہو جانے والی ترقی، جوئے سے حاصل ہونے والے پیسے کی طرح ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔

ایک دانشور کا قول ہے کہ:

"سب سے زیادہ مشکل اور خطرناک راستہ شارٹ کٹ

ہوتا ہے ، لمبے راستے میں اگرچہ وقت زیادہ لگتا ہے
لیکن انسان اطمینان سے پہنچ جاتا ہے ۔"

کبھی انسان اتفاق سے سب سے چھوٹے راستے کے ذریعے بھی منزل تک پہنچ جاتا ہے لیکن اگر کوئی قوم ایسے چھوٹے راستے کے مل جانے کے انتظار میں بیٹھی رہے تو گویا اس نے موت اور فنا کا راستہ اختیار کیا ہے۔

جن قوموں نے ترقی کی ہے انھوں نے کبھی اتفاقات کا انتظار نہیں کیا۔ لیکن سست اور کاہل لوگ جو سوچنا بھی نہیں چاہتے۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ :۔

" اتفاق تو دیکھو، "انسان کو اسی طرح چانس ملنا چاہیے ———— ! "

حالانکہ قوموں کی ترقی میں جس چیز نے کوئی کام نہیں کیا وہ یہی "اتفاق" اور "چانس" تھی۔ اگر ترقی یافتہ قوموں کو واقعی چانس ملا بھی ہے تو وہ کام اور محنت کرنے کا چانس ملا ہے۔

جو قوم ترقی کی راہ میں پسینہ نہیں بہانا چاہتی اور " اتفاق "کے خیالی زینہ پر قدم رکھ کر اوپر جانا چاہے ، وہ یقیناً اوپر پہنچنے سے پہلے نیچے پہنچ جائے گی۔

کہتے ہیں کہ : سیب اچانک اتفاق سے نیوٹن پر گرا اور دنیا کا ایک راز (کشش ثقل) اسے معلوم ہوگیا۔ لیکن اشتباہ یہیں پر ہے کہ ایسا حادثہ دسیوں بار دوسروں کے ساتھ بھی پیش آیا ہے۔ لیکن انھوں نے اس اتفاق کے نتیجے میں ایسا قانون دریافت کیوں نہیں کیا ؟

حقیقت یہ ہے کہ ایسا قانون دریافت کرنے کے تمام شرائط ، سیب

گرتے وقت نیوٹن کو حاصل تھے۔ اس نے اس سلسلے میں مسلسل مطالعہ اور غور و فکر کیا تھا۔ اگر کوئی اور شخص بھی اس کی طرح غور و فکر اور مطالعہ کیے ہوئے ہوتا اور چیزوں کے اسباب پر اس نے تحقیق کی ہوتی تو وہ بھی ایسا قانون دریافت کر سکتا تھا۔

اگر ایک سائنسدان نے صابن کے بلبلوں کے رنگ دیکھ کر روشنی کی تحلیل کر ڈالی تو یہ اتفاق نہیں تھا۔ اس نے اس سلسلے میں مطالعہ اور تحقیق کا کام پہلے سے کیا ہوا تھا۔ ورنہ دھوبیوں کے سامنے ہر روز صابن کے بلبلے اکٹھے ہوتے ہیں لیکن ان کو کوئی قانون نہیں سوجھتا۔

تقدیر کا غلط مفہوم

اگر ہم تقدیر کو کامیابی کے غیر حقیقی اور موہوم اسباب میں شمار کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آسمانی ادیان اور قرآن مجید نے اسے ایسا قرار دیا ہے بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ بہت سے سادہ دل افراد یہ خیال کرتے ہیں کہ:

"ہم تو تقدیر کے قیدی ہیں، ہماری تقدیر بنانے اور بگاڑنے والا کوئی اور ہے۔"

خواہ ہم خدا پرست ہوں یا مادّہ پرست؛
خواہ ہمارا یہ اعتقاد ہو کہ کائنات کو ایک سوچے سمجھے نظام کے تحت کوئی "عقل" سنبھالے ہوئے ہے؛
یا ہم یہ کہتے ہوں کہ کائنات بس اتفاق سے بے شمار ایٹموں کے ملنے سے وجود میں آگئی ہے۔
بہرحال، ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ شراب کے عادی

جوان نے جب سے شراب پینی شروع کی ہے اسی وقت سے اس نے اپنی بُری تقدیر کی داغ بیل اپنے ہاتھوں سے ڈال دی تھی۔ یہ جوان ایک مدّت بعد جگر کا مریض ہو کر ہسپتال میں پڑا ہوگا یا اس کی حرکتِ قلب بند ہو جائے گی یا اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔

ہم کو یقین ہے کہ جس شخص کو درندے رام کرنا نہیں آتا ہو، اگر وہ شیر اور چیتے کی دُم سے کھیلنا شروع کر دے تو وہ چند لمحوں میں ان درندوں کی غذا بن جائے گا۔

یقیناً جوئے میں مبتلا جوان کو اگر ہارنا پڑے تو اپنی اس بُری تقدیر کا ذمّہ دار وہ خود ہے کوئی اور نہیں۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

دیوانگی است، قصہ تقدیر و بخت نیست
از بام سرنگون شدن و گفتن این قضا است

در آسمانِ علم، عمل بہترین پر است
در کشورِ وجود، ہنر بہترین غنا است

میکوش گرچہ عزم تو زاندیشہ برتر است
میپوی گرچہ راہ تو ذرکام اژدھا است

(تقدیر سمجھتے ہوئے چھت سے نیچے کود پڑنا دیوانگی ہے، اس کا تقدیر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آسمانِ علم میں اُڑنے کے لیے عمل بہترین پر ہے۔ وجود کے ملک میں رہنے کے لیے ہنر بہترین آسودگی ہے۔ تجھے کوشش کرنی چاہئے تھی

اگرچہ تیرا عزم خیال کی حدوں سے باہر ہو، تجھے تیز چلنا
چاہئے تھا اگرچہ تیرا راستہ اژدھے کے منہ میں سے گزرتا ہو۔)

جس طالب علم نے شب و روز ایک کرکے علم حاصل کیا ہے اس نے اسی وقت سے اپنی تقدیر بنا لی تھی جب اس نے یونیورسٹی میں پہلا قدم رکھا تھا۔

خلاصہ یہ کہ ہمارے آج کے کام ہمارے مستقبل کو سنوارنے والے ہوتے ہیں۔ دنیا میں ہونے والے کام زنجیر کے حلقوں کی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اگر ایک حلقہ بیچ میں سے ٹوٹ جائے تو زندگی کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور ان حلقوں میں سے ہر حلقہ اس کے بعد آنے والے حلقے کا سبب ہوتا ہے۔

دنیا کے واقعات کا نظام ہی علت اور معلول کے ایک سلسلے پر مشتمل ہے۔ مثلاً آج کے واقعات کل کے واقعات کی علت اور سبب ہوں گے۔ اسی طرح کل کے واقعات پرسوں کے واقعات کا سبب ہوں گے۔ آئندہ کا ماجرا وجود کے قلم سے آج کی پیشانی پر لکھا ہوتا ہے۔ پہلے کے حالات اپنے وجود کی زبان سے یہ کہتے ہیں کہ:

آج کے حالات آئندہ کل کے حالات کا پیش خیمہ ہیں۔
ان دونوں حالات میں جو رشتہ ہے وہ ٹوٹ نہیں سکتا
اگر کوئی خالق کائنات کے نظام کے اسباب پر
غور کرے تو وہ آئندہ ہونے والے واقعات کی
واضح طور پر پیش گوئی کر سکتا ہے۔

اگر ہم مذہبی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ انسان اپنی تقدیر کی حدوں کے اندر محدود ہے، یا قرآن میں اگر لکھا ہے کہ جو کام بھی تم انجام دیتے ہو وہ لوح محفوظ میں پہلے سے لکھا ہوتا ہے تو اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہم اس تقدیر کے قیدی ہیں جس کے مطابق عمل کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ خدائے علیم وخبیر ماضی اور مستقبل کے بھی تمام حالات سے پوری طرح باخبر ہے۔

وہ جانتا ہے کہ کون شخص اپنے اختیار سے کیا کام انجام دے گا اور ان کاموں کے نتیجے میں اپنی اچھی یا بُری تقدیر خود بنائے گا۔

خدا واقف ہے کہ انسان کیا کرے گا لیکن انسان پوری طرح آزاد ہے کہ وہ اپنی تقدیر جیسی چاہے بنائے۔

قسمت کے بارے میں غلط خیال

بعض لوگ اپنے ضمیر کو دھوکا دیتے ہیں وہ عقل کے فیصلے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ عقل مولانا رومی کے بقول کہتی ہے کہ ؎

اینکہ گوئی این کنم یا آن کنم
این دلیل اختیار است اے صنم

(یہ جو تم کہتے ہو کہ میں یہ کروں گا، وہ کروں گا تو اے صنم! یہ کہنا خود اختیار کی دلیل ہے)

لوگ تصور کرتے ہیں کہ وہ مجبور پیدا ہوئے ہیں اور ان کو کام کرنے کا بالکل اختیار حاصل نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایسے پتھر کی طرح ہیں جسے اوپر سے چھوڑ دیا گیا ہو اور نیچے آنے کے علاوہ اس کا کوئی اور راستہ نہ ہو یا وہ ایسے

پودے کی طرح ہیں جو ایک خاص انداز سے پھلتا پھولتا ہے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی اور انداز نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنی عقل اور فطرت کے خلاف خیال میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں میں آزاد اور خود مختار ہے۔ وہ اپنے اختیار سے خود کو خوش قسمت یا بدقسمت بناتا ہے۔

ماحول کا جبر

اگر پہلے اپنے کاموں کے بُرے اثر کو "قضا و قدر" کی گردن پر ڈالا جاتا تھا اور خود کو بری الذمہ قرار دیا جاتا تھا تو آجکل بعض لوگ اس کی بجائے "ماحول کے جبر" کو اپنے برے اعمال کے نتائج کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

گو کہ یہ خود کو دھوکے میں رکھنا ہے اور اپنے غلط کاموں پر سرپوش ڈھانکنے کے مترادف ہے۔

اب ہم دیکھیں گے کہ "ماحول کے جبر" سے کیا مراد ہے جس کا ذکر آجکل کی فلسفیانہ اور معاشرتی کتابوں میں کیا جاتا ہے؟!

مراد یہ ہے کہ انسان کی زندگی کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کرے اور ماحول کا ساتھ دے۔

مثلاً آج صنعتوں سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کیا جاتا ہے، بجلی کے سائے میں آرام کیا جاتا ہے۔ جدید طریقوں سے تعلیم و تربیت کا انتظام ہوتا ہے تو انسان کو اپنے معاشرے کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ خود کو دوسروں کے جیسا بنا کر رہنا پڑتا ہے۔ اس حد تک "ماحول کا جبر" ہم تسلیم کرتے ہیں۔

لیکن جو لوگ اس بات سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں

کہ ہر قسم کی غلط روش اور بے راہ روی کا ذمہ دار ماحول اور معاشرہ کو ٹھہرایا جائے۔ اگر جوان نسل برباد ہو رہی ہے تو ایسے لوگ کہتے ہیں کہ :

" جوانوں کا کوئی قصور نہیں۔ ماحول ہی خراب ہے۔"

حالانکہ ایسے لوگ ایک علمی اور فلسفیانہ بات کا مذاق اڑاتے ہیں ایسے کاموں کی ذمہ داری خود انسانوں پر عائد ہوتی ہے۔ انسان کو آزادی ہے چاہے اچھا کام اختیار کرے یا بُرا۔

خدا کی عنایتوں کے سائے میں

یہاں پر یہ نکتہ بھی ذکر کرنا ضروری ہے کہ انسان اپنی تقدیر بنانے یا بگاڑنے کے سلسلے میں آزاد تو ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے کسی ہستی کی ضرورت نہیں ہے اور وہ پروردگار کی قدرت سے مدد لیے بغیر سب کچھ کر سکتا ہے۔

یہ بات نہ تو آسمانی ادیان قبول کرتے ہیں اور نہ علم اور فلسفہ کے مطابق یہ بات قابل قبول ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو ——— اسے خدا نے بنایا ہے اور اسے زندگی گزارنے کے لیے ہزاروں چیزوں کی احتیاج ہے اور وہ اپنی احتیاج کی تکمیل کے لیے خدا کی دی ہوئی طاقت کو استعمال کرتا ہے۔

انسان ایک ایسے بلب کی طرح سے ہے جسے روشنی دینے کے لیے پاور ہاؤس سے منسلک ہونے کی ضرورت ہے۔ لیکن اسے اختیار ہے کہ وہ مسجد کو روشن کرے یا نائٹ کلب کو۔

انسان کو اگر یہ احساس رہے کہ وہ خدا کی لامحدود طاقت سے منسلک ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ سست نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کی کارکردگی میں اضافہ ہوگا۔ کیونکہ

اسے یہ احساس ہوگا کہ اس کی پشت پناہی کے لیے کوئی طاقت کا سرچشمہ موجود ہے۔ اور وہ اس دنیا کے مصائب کے مقابل تنہا نہیں ہے۔

جو فوجی دشمن سے لڑنے کے لیے پہلی صفوں میں ہوتے ہیں وہ اسی صورت میں بہادری سے لڑ سکتے ہیں جبکہ ان کو اطمینان ہو کہ پیچھے سے کمک آسکتی ہے۔ اگر یہ اطمینان نہ ہو تو ان کے جذبات سرد پڑ جائیں گے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ایک میدانِ جنگ میں اپنے بیٹے کو جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے سلسلے میں ہدایات دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"وَاعْلَمْ اَنَّ النَّصْرَ مِنْ عِنْدِاللّٰہِ"

(میرے بیٹے! جان لو کہ اصل مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے)

موروثی ثروت

ہمارے ایک دانشمند دوست بڑے لوگوں کی اولاد کے سلسلے میں جو نعمت و عزت کے گہوارے میں آنکھ کھولتے ہیں اور اپنی خاندانی حیثیت کے سائے میں بڑے عہدوں تک پہنچ جاتے ہیں، کہتے تھے :

"بعض لوگ ماں کے پیٹ ہی سے خوش قسمت پیدا ہوتے ہیں۔ اور فلاں شخص بھی دنیا میں خوش قسمت پیدا ہوا ہے۔"

وہ خوش قسمتی کو دولت اور آسائشوں کی رہینِ منت سمجھتے تھے۔ کہ بچہ دولت اور آسائشوں کی بنیاد پر ایک مدت تک لوگوں کی نظروں میں عزیز اور گرامی قدر رہتا ہے اور اسے کام اور کوشش کی ضرورت نہیں رہتی۔

ہم اپنے اس دوست کے اس خیال کو مطلق طور پر قبول نہیں کرتے کیونکہ اس حد تک تو درست ہے کہ ماں باپ کی شرافت و نجابت، خاندان کی دولت و آسائش

انسان کی ترقی کو آسان بنا دیتی ہے اور ان چیزوں سے انسان بہت مدد لے سکتا ہے۔
لیکن اس نکتہ سے غافل نہیں رہنا چاہیئے کہ اگر بڑے گھرانے کے بچے کو درست رہنمائی میسر نہ ہو تو وہ غریب بچے سے کئی گنا زیادہ ذلیل اور بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔

باپ کی دولت اور شہرت اس وقت اولاد کو اچھی قسمت سے ہم آغوش کرتی ہے جب وہ اس دولت اور شہرت کی وجہ سے سستی، عیاشی اور بُرے اخلاق میں مبتلا نہ ہو۔ افسوس کی بات یہی ہے کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ان خداداد نعمتوں سے صحیح فائدہ اٹھایا جائے۔ عام طور پر نتیجہ خراب ہی نکلتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ پیغمبروں نے غریب گھرانوں میں پرورش پائی۔ عظیم لوگ غریبوں کی جھونپڑیوں ہی سے نکل کر معاشرے کے میدان میں قدم رکھتے ہیں۔
حتیٰ کہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ:

"خاص حالات میں غربت اعلیٰ ذہانت کا گہوارہ ثابت ہوتی ہے۔"

آزمائش اور تجربے نے اس بات کی تائید کی ہے۔

"خاتم الشعراء" ابوتمام نے "حماسہ" اور دیگر اچھی کتابیں لکھیں، وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے گزارے کے لیے کافی عرصہ تک بہشتی کا کام کرتا رہا۔

اسلام کی سب سے بڑی جغرافیائی کتاب "معجم البلدان" چھٹی صدی ہجری میں لکھی گئی۔ اس کا مؤلف "یاقوت حموی" ایک غلام سے زیادہ نہ تھا۔ ابراہیم حموی اسے تجارت کے لیے مختلف شہروں میں بھیجا کرتا تھا۔ وہ شہروں کے

جغرافیائی اور موسمی حالات لکھتا جاتا تھا۔ آخر کار اس نے اپنی ان تمام یادداشتوں کو دس بڑی جلدوں میں تدوین کیا۔ آج بھی گزشتہ زمانوں میں شہروں کے حالات سے واقفیت کے لیے اسی کتاب کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

"امیر کبیر" جیسا ذہین آدمی، ایک باورچی کا بیٹا تھا۔ اس نے عوام کے ایسے طبقے میں آنکھ کھولی جس نے ظالم حاکموں کے مظالم سہے تھے۔ یہ تجربے اتنے تلخ تھے کہ انھوں نے اُسے ایک حساس، اعلیٰ جذبوں سے کام لینے والا اور خود پر اعتماد کرنے والا مرد بنا دیا۔

"سر تھامس لارنس" ایک بے روزگار باپ کا بیٹا تھا لیکن اس میں ذہانت اور دوسری صلاحیتیں پائی جاتی تھیں۔ پانچ سال کی عمر میں وہ اشعار یاد کر لیتا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں اسے ایک عید کے موقع پر "خوبصورت ہنروں والی انجمن" کی طرف سے ایک تصویر بنانے پر انعام دیا گیا۔

"نپولین" کہتا ہے کہ:

"جوان کے ہاتھ میں دولت ایک ایسا مہلک ہتھیار ہے جس سے وہ خود کو اور اپنے متعلقین کو ہلاک کر لیتا ہے۔"

عربی زبان کا ایک شاعر کہتا ہے کہ ؎

" ان الشباب والفراغ والجدة
مفسدة للمرء ای مفسدة

(جوانی، بے کاری اور دولت کی فراوانی، انسان کی تباہی
کا سبب ہوتے ہیں اور وہ کیا ہی بُری تباہی ہوتی ہے؟!)

ہم نے کہا تھا کہ جب تک ان نعمتوں کو صحیح طور پر استعمال نہ کیا جائے اس وقت تک یہ چیزیں انسان کے لیے مُضر ثابت ہوتی ہیں اور اس کے لیے صحیح ہدایات کا ملنا ضروری ہوتا ہے۔

شیخ سعدی کہتے ہیں کہ ؎

وقتی افتاد فتنہ ای در شام
ہر یک از گوشہ ای فرا رفتند

پسرانِ وزیر ناقص عقل
بہ گدائی بہ روستا رفتند

روستا زادگانِ دانش مند
بہ وزیری پادشاہ رفتند

(جب ملک شام میں فتنہ برپا ہوا تو سب لوگوں نے گوشوں میں پناہ لی۔ وزیر کے نالائق بیٹے گداگری کے لیے دیہات چلے گئے اور دیہات میں پیدا ہونے والے دانشور بادشاہ کے وزیر بن گئے۔)

فارسی میں مثل مشہور ہے کہ:
"فقر، مادرِ صنایع است۔"

یعنی فقر اور غربت، صنعتوں کی ماں ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ یورپی مصنوعات جاپان میں بھری ہوئی تھیں۔ لیکن جب پردیسی مصنوعات کا دروازہ جاپانیوں نے خود بند کر دیا اور جاپانی وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ:

"جب تک خود جاپان میں جوتے تیار نہیں ہونے لگیں
اس وقت تک سب کو ننگے پیر چلنا چاہیئے۔"

اس دن سے جاپانی قوم نے ہر شعبے میں ترقی کی کوشش کی۔ اس طرح وہ غیروں کی محتاجی سے آزاد ہو گئے اور اپنے خام مال سے خود چیزیں تیار کرنے لگے۔

"شیکسپیئر" کا حسب نسب صحیح طرح معلوم نہیں ہے لیکن سب کہتے ہیں کہ وہ ایک قصائی کا بیٹا تھا۔ شیکسپیئر خود لڑکپن میں اون صاف کرنے کا کام کرتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ایک اسکول میں چپراسی تھا۔ بعد میں منشی بنا لیکن اس انتہائی ذہین آدمی میں بہت سے تجربات کا نچوڑ موجود تھا۔ اس نے تقریباً تمام پیشوں کو اختیار کیا۔ اس سے اس کے ہوش، ذوق، مطالعہ اور تجربے میں اضافہ ہوا۔ وہ قطعات لکھنے لگا۔ اس کے قطعات آج بھی ادبی دنیا کے شاہکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

درزی کی دکان سے صدارت کی کرسی تک

"اینڈرو جیکسن" نامی صدر عقل و تدبیر کے سلسلے میں مشہور تھا۔ اس نے واشنگٹن میں ایک لمبی تقریر کی۔ اس میں اس نے اپنی زندگی کے مرحلے بتائے کہ پہلے وہ درزی تھا۔ پھر کئی مرحلوں کے بعد صدر بنا۔ لوگوں کو اس کے

بیان سے تعجب ہوا۔ اس نے کہا کہ:

"لوگ مجھے حقارت سے دیکھتے ہیں کہ میں پہلے درزی تھا۔ لیکن میں درزی ہونے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ جب میں درزی تھا تو امانت اور مہارت میں مثال بن گیا تھا۔ میں گاہکوں کو سلے ہوئے کپڑے بروقت دے دیتا تھا۔ اور سب میری کٹائی اور سلائی سے راضی رہتے تھے۔"

ہم نے اپنی زندگی میں بڑے لوگوں کی ایسی اولاد بھی دیکھی ہے جو صحیح رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے بُرے حالات کا شکار ہو گئی۔

لیکن اس کے برعکس ہم نے ایسے جوانوں کو بھی دیکھا ہے۔ جنھوں نے اپنے حالات خود سدھارے ہیں اور ترقی کی سیڑھی پر اوپر چڑھتے گئے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ خواہ وہ علم و اخلاق کے شعبے ہوں یا سیاست و صنعت کے، عظیم لوگ وہی ثابت ہوئے ہیں جو اپنی ذاتی صلاحیت اور کافی محنت کی روشنی میں ایک مقام حاصل کر پائے ہیں۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے ان کی ذاتی صلاحیتوں کے علاوہ اور کوئی چیز مؤثر ثابت نہیں ہوئی ہے۔

یادداشت

یادداشت

یادداشت

ہماری مطبوعات

درسِ قرآن
مکتبِ تشیع اور قرآن
اسرارِ نہج البلاغہ
نہج البلاغہ سے چند منتخب خطبے
مذہبِ اہلِ بیتؑ
شیعیت کا آغاز کب اور کیسے
فلسفۂ امامت
اہلِ بیتؑ آیتِ تطہیر کی روشنی میں
ائمہ سیریز (مکمل سیٹ)
سوانح حیات حضرت فاطمۃ الزہراؑ
اہلِ بیتؑ کی زندگی، مقاصد کی ہم آہنگی، زمانہ کی نیرنگی
مثالی عزاداری کیسے منائیں؟
آمریت کے خلاف ائمہ طاہرینؑ کی جدوجہد
صدائے حضرت سجادؑ
سوانح حیات حضرت امام حسینؑ
تفسیرِ سیاسی قیامِ امام حسینؑ
ائمہ معصومینؑ کی سیاسی زندگی کا تحقیقی جائزہ
فلسفۂ عزاداری و قیامِ امام حسینؑ
اثباتِ وجودِ خدا
۲۰ جواب
آسان عقائد (دو جلدیں)
تعلیمِ دین سادہ زبان میں (دو جلدیں)
حسینؑ شناسی
انقلابِ حسینؑ پر محققانہ نظر
فکرِ حسینؑ کی الف، ب

تفسیرِ عاشورا
عزاداری کیوں؟
عاشورا اور خواتین
پیامِ شہیداں
ہمارا پیام
آزمائش
درسِ انقلاب
اسلامی تحریک قرآن و سنت کی روشنی میں
شناختِ استکبار
عوامی حکومت یا ولایتِ فقیہ
کتاب المومن
خاندان کا اخلاق
ازدواج در اسلام
اسلام میں خواتین کے حقوق
آسان مسائل
عورت پردے کی آغوش میں
اسلامی اتحاد، مسلکِ اہلِ بیتؑ کی روشنی میں
ہدایت و کیونزم
خاک پر سجدہ، مقصد، اہمیت، حقیقت
عظیم لوگوں کی کامیابی کے راز
انسان کے کمال میں اخلاق کا کردار
دعائے افتتاح - دعائے ندبہ
زیارتِ جامعہ
نظامِ مرجعیت شہیدین کی نظر میں
فاطمہ زہراؑ اسلام کی مثالی خاتون

اہلبیتؑ کی زندگی
مقاصد کی ہم آہنگی۔۔زمانہ کی نیرنگی

تالیف : مفکر اسلام' شہید رابع حضرت آیت اللہ سید محمد باقر الصدرؒ

امت اسلامی کے انحطاط و پستی کا راز قرآن و اہلبیتؑ سے روگردانی میں پوشیدہ ہے۔ رسول خداؐ نے بڑے واضح انداز میں فرمایا تھا:

"میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں (ثقلین) چھوڑ کر جارہا ہوں' ایک قرآن اور دوسرے اہلبیتؑ جو کوئی ان دونوں سے متمسک رہے گا' کبھی گمراہ نہ ہوگا"۔

مگر افسوس کہ ان دونوں پر ہی دوستوں کے ہاتھوں کاری ضرب لگی ہے۔ آج مسلمانوں کے گھر گھر میں قرآن کریم ہونے کے باوجود' مسلمان اس سے اجنبی ہیں۔ قرآن کے سمجھ میں نہ آنے ہی کو اس کی عظمت گردانا جاتا ہے حالانکہ خود قرآن اپنی کثیر آیات میں اس کتاب کے انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ دوسری طرف اہلبیتؑ کی عظمت کو فقیروں کو دولتمند اور ذخائر کا مالک بنانے میں پنہاں سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان خود اپنے دستور ہدایت ہی سے تہی دست ہو جائے تو پھر غیروں کیلئے نفوذ آسان ہو جاتا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ یہی ہوا ہے۔

اس کتاب میں ائمہ شناسی کے بے بہا ذخائر موجود ہیں مگر ان صاحبانِ علم و دانش کیلئے جو فہم اور شعور و ادراک رکھتے ہیں اور جو تدبر و تفکر کو اپنا شیوۂ زندگی قرار دیتے ہیں۔

یہ کتاب ائمہ کی سیاسی زندگی کا نقشہ کھینچتی ہوئی آج مسلمانوں کو سیاسی اور اجتماعی میدان میں درپیش بہت سے مسائل کا جواب پیش کرتی ہے۔ مثلاً حزب مخالف کی کیا پالیسی ہونا چاہئے' اقلیت کا اکثریت کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہئے' اپنی کثرت تعداد سے کس حد تک متاثر ہونا چاہئے اور یہ کہ آج کے اس پرآشوب دور میں کس قسم کے اقدامات اپنانے کی ضرورت ہے کہ مسلمان خود کو فساد کے دلدل سے نکال کر ساحل نجات تک پہنچا سکیں اور اپنے وطن کو گلزار بنا سکیں۔

دیدہ زیب سرورق	سفید کاغذ	عمدہ طباعت	آسان و سادہ ترجمہ	۲۶۰ صفحات